POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 10 - 11 June 2026, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages 8

HAMARI ZABAN (Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان
اشاعت کا 87واں سال

Date of Publication: 09-06-2026 • Price: 5/- • 15-28 June 2026 • Issue: 23, 24 • Vol:85

۱۵ تا ۲۸ رجون ۲۰۲۶ء • شمارہ: ۲۳، ۲۴ • جلد: ۸۵

# میں تھک گیا ہوں ہوا سے کہو بجھائے مجھے

انجینئر محمود اقبال (علیگ)

عجب چراغ ہوں دن رات جلتا رہتا ہوں
میں تھک گیا ہوں ہوا سے کہو بجھائے مجھے

28 مئی 2026 کے دن ٹھیک دوپہر کے وقت اردو کے نامور عوامی اور مثالی شاعر ڈاکٹر بشیر بدر نے بھوپال میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ایک چراغ تھا کہ گل ہوگیا۔ اور عین عیدالاضحیٰ کے دن اردو دنیا کو سوگوار کر گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے 91 سال کی بھرپور عمر پائی اور شاید اسی لیے شکوہ بھی کیا تھا کہ 'میں تھک گیا ہوں...'۔ چوں کہ وہ عمر کے آخری عرصے میں کافی علیل بھی رہنے لگے تھے۔ مگر ہم اردو والے ڈاکٹر بشیر بدر کو کبھی بھولیں گے نہیں۔ ان کی یاد میں انھی کا شعر خراجِ عقیدت کے طور پر پیش خدمت ہے:

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہوجائے

بشیر بدر یادوں کو زندگی کا سرمایہ قرار دیتے ہیں۔ انسان کو معلوم نہیں کہ زندگی کب اور کہاں اختتام کو پہنچے؟ اس لیے محبت بھری یادیں ہمیشہ ساتھ رہنی چاہئیں۔ اس شعر میں زندگی کی ناپائیداری اور یادوں کی اہمیت کو نہایت خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ بشیر بدر اردو ادب کے معروف ترین غزل گو شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا اصل نام سید محمد بشیر تھا، جبکہ ادبی دنیا میں وہ بشیر بدر کے نام سے مشہور ہوئے۔ وہ 15 فروری 1935 کو اتر پردیش کے ضلع امبیڈکرنگر (فیض آباد کا علاقہ، موجودہ ایودھیا) کے قصبہ ہنسور کے قریب واقع گاؤں بگیا میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم مختلف شہروں میں حاصل کی۔ بشیر بدر نے اپنی شاعری کے ذریعے جدید اردو غزل کو ایک نیا انداز، نئی زبان اور تازہ احساسات عطا کیے ہیں۔ ان کی غزلوں میں محبت، جدائی، تنہائی، انسانی رشتوں کی نزاکت اور روزمرہ زندگی کے تجربات نہایت سادہ مگر دل نشیں انداز میں بیان ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام نہ صرف اردو قارئین بلکہ غیر اردو داں حلقوں میں بھی بے حد مقبول ہوا ہے۔ زندگی کے ابتدائی دور میں معاشی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ والد کے انتقال کے بعد کچھ عرصہ ملازمت کی، بعد ازاں تدریس اور ادبی سرگرمیوں سے وابستہ ہو گئے۔ وہ مختلف تعلیمی اداروں میں اردو کے استاد رہے اور مشاعروں میں ان کی شرکت کو بے حد پسند کیا جاتا تھا۔ بشیر بدر کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی سادگی، روانی اور دل میں اتر جانے والی کیفیت ہے، جس نے انھیں جدید اردو غزل کا ایک نمایاں اور یادگار شاعر بنا دیا تھا۔

بشیر بدر کی ابتدائی زندگی جدوجہد، محنت اور علم دوستی سے بھرپور تھی۔ ان کے والد سید محمد نظیر پولیس محکمے میں ملازم تھے، اس لیے بچپن مختلف شہروں میں گزرا۔ والد کے اٹاوہ تبادلے کے بعد وہ اٹاوہ آ گئے جہاں انھوں نے ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کی۔ بشیر بدر ابھی نوجوان ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ اس حادثے نے ان کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ گھر کی معاشی ذمے داریاں ان کے کندھوں پر آ گئیں اور انھوں

**ایک شمارہ**
**بشیر بدر**
**کے نام**

نے اپنی تعلیم کچھ عرصے کے لیے چھوڑ کر 84 روپے ماہانہ تنخواہ پر پولیس کی ملازمت کی۔ اُس زمانے میں 84 روپے ایک بڑی رقم ہوتی تھی۔ شاعری کا شوق انھیں بچپن ہی سے تھا۔ ساتویں جماعت میں ان کی ایک غزل معروف ادبی رسالے 'نگار' میں شائع ہوئی تھی، جس نے ادبی حلقوں میں ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کرایا۔ بیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے ان کی غزلیں ہندستان اور پاکستان کے معتبر رسائل میں شائع ہونے لگیں۔ معاشی مشکلات کے باوجود انھوں نے تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔ پہلے ادیب اور ادیبِ کامل کے امتحانات پاس کیے، پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے، ایم اے اور بعد ازاں پی ایچ.ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یہی علمی اور ادبی سفر آگے چل کر انھیں اردو غزل کے سب سے مقبول شاعروں میں شامل کرنے کا سبب بنا۔ ان کی ابتدائی زندگی کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ شدید مالی مشکلات، خاندانی ذمے داریوں اور ملازمت کے باوجود انھوں نے تعلیم اور شاعری دونوں کو نہیں چھوڑا اور یہی استقامت بعد میں ان کی کامیابی کی بنیاد اور ضامن بنی۔ حیدرآباد دکن کے مقبول ترین شاعر مخدوم محی الدین اور بشیر بدر کی ابتدائی زندگی اور بچپن میں، غربت، عزلت، محبت اور محنت اقدارِ مشترک نظر آتے ہیں۔ دونوں کی آواز اور لہجہ کھنک دار اور ترنم سے بھرپور تھا۔ مخدوم کا کلام بہت ہی مختصر ہے تو اس کے برعکس بشیر بدر کا کلام شعری مجموعوں تک پھیلا ہوا ہے۔

ڈاکٹر بشیر بدر کی تعلیمی سرگرمیاں ان کی شخصیت کا نہایت اہم پہلو ہیں۔ وہ صرف ایک ممتاز شاعر ہی نہیں بلکہ ایک سنجیدہ محقق، استاد اور ادبی دانشور بھی تھے۔ تعلیم کے دوران وہ اردو زبان و ادب کے گہرے مطالعے میں مصروف رہے اور کلاسیکی و جدید شاعری پر خصوصی توجہ دی تھی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ تدریس کے شعبے سے وابستہ ہو گئے۔ اردو ادب سے انھیں خاص شغف تھا اور طلبہ کی ادبی و تحقیقی رہنمائی کی۔ ان کی تدریس کا انداز سادہ، دلنشین اور فکری گہرائی لیے ہوئے تھا، جس کی وجہ سے طلبہ ان سے خاص طور پر متاثر ہوتے تھے۔ بشیر بدر نے تحقیق و تنقید کے میدان میں بھی خدمات انجام دیں۔ پی ایچ.ڈی کے دوران انھوں نے اردو ادب کے اہم موضوعات پر علمی تحقیق کی، جس سے ان کی ادبی بصیرت مزید نکھر کر سامنے آئی۔ وہ ادبی سمیناروں، مشاعروں اور علمی مذاکروں میں بھی شریک ہوتے رہے اور اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے کام کرتے رہے۔ یہ ان کی علمی لگن اور محنت کی روشن مثال ہے۔ بعد ازاں وہ مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی اور مختلف ادبی اداروں سے بھی وابستہ رہے، جہاں انھوں نے اردو زبان، تحقیق اور شاعری کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کی علمی و ادبی خدمات کے باعث انھیں اردو دنیا میں ایک استاد شاعر اور محقق کی حیثیت سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر بشیر بدر کی شاعری جدید اردو غزل کا ایک اہم اور منفرد باب سمجھی جاتی ہے۔ انھوں نے غزل کو روایتی انداز کے ساتھ جدید احساسات، روزمرہ زندگی کے تجربات اور انسانی رشتوں کی نزاکتوں سے جوڑ کر ایک نئی جہت عطا کی۔ ان کی شاعری میں محبت، جدائی،

قارئین! اب 'ہماری زبان' کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کر سکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

تنہائی، یاد، وقت کی بے ثباتی اور انسانی تعلقات کے بدلتے رنگ نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی فنی خصوصیت سادگی اور سلاست ہے۔ بشیر بدر نے مشکل اور ثقیل الفاظ کے بجائے عام فہم زبان استعمال کی، جس کی وجہ سے ان کے اشعار عام لوگوں سے لے کر ادبی حلقوں تک یکساں مقبول ہوئے۔ ان کی غزلوں میں نغمگی، روانی اور دل میں اتر جانے والی کیفیت پائی جاتی ہے۔ بشیر بدر کی شاعری میں جدید انسان کی تنہائی، ٹوٹتے رشتے، محبت کی لطافت اور سماجی تبدیلیوں کا گہرا شعور بھی ملتا ہے۔ انھوں نے ایسے موضوعات کو شاعری کا حصہ بنایا جو عام زندگی سے براہِ راست تعلق رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام نئی نسل میں بھی بے حد مقبول ہوا۔ ان کے اشعار میں خوبصورت پیکر تراشی، تازہ علامتیں اور دلکش منظر نگاری بھی نمایاں ہے۔ پھول، خوشبو، بارش، دھوپ، شام، یاد اور تنہائی جیسے الفاظ ان کے ہاں بار بار آتے ہیں اور ایک خاص جمالیاتی فضا پیدا کرتے ہیں۔ بشیر بدر بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور ان کے متعدد شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مشاعروں میں وہ اپنا کلام ترنم سے پڑھتے تھے۔ اردو ادب میں بشیر بدر کا مقام اس وجہ سے منفرد ہے کہ انھوں نے غزل کو صرف عشق و محبت تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے انسانی احساسات اور معاشرتی تجربات کا آئینہ بنا دیا۔ ڈاکٹر بشیر بدر کے اشعار اردو شاعری میں اپنی سادگی، گہرائی اور انسانی جذبات کی خوبصورت ترجمانی کی وجہ سے بے حد مقبول ہیں۔ ان کے اشعار میں محبت، جدائی، دوستی، زندگی کے تجربات، انسانی رویّے اور وقت کی بے ثباتی جیسے موضوعات نمایاں نظر آتے ہیں:

دشمنی جم کر کرو لیکن یہ گنجائش رہے
جب کبھی ہم دوست ہو جائیں تو شرمندہ نہ ہوں

یہ شعر انسانی تعلقات کے اعلا اخلاقی اصولوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر اختلاف یا دشمنی ہو بھی تو، اتنی شدت اختیار نہ کرے کہ صلح اور دوستی کی راہ بند ہو جائے۔ یہی شعر 1972 کے شملہ معاہدے کے موقعے پر بھی بہت مشہور ہوا تھا۔ اس شعر کو سابق وزیرِ اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹّو نے بھی حوالے کے طور پر پیش کیا تھا، اس کے بعد پورے برِّصغیر میں یہ شعر زبانِ زد عام ہو گیا تھا:

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے، ذرا فاصلہ سے ملا کرو

اس شعر میں جدید معاشرے کی سرد مہری اور بدلتے ہوئے انسانی رویّوں کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ شاعر اشارہ کرتا ہے کہ آج کے دور میں ضرورت سے زیادہ بے تکلفی بعض اوقات لوگوں کو ناگوار گزرتی ہے، اس لیے تعلقات میں ایک مناسب فاصلہ برقرار رکھنا ضروری ہے:

سر جھکاؤ گے تو پتھر، دیوتا ہو جائے گا
اتنا مت چاہو اسے، وہ بے وفا ہو جائے گا

یہ شعر محبت میں حد سے زیادہ عقیدت اور خود سپردگی کے نتائج پر روشنی ڈالتا ہے۔ شاعر کے مطابق کسی شخص کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینا بعض اوقات اس کے رویّے کو بدل دیتا ہے:

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

یہ شعر سماجی بے حسی اور فساد و تشدد کے خلاف ایک طاقتور آواز ہے۔ شاعر بتاتا ہے کہ ایک گھر بنانے میں برسوں لگ جاتے ہیں، مگر اسے تباہ کرنے میں چند لمحے کافی ہوتے ہیں:

میں چپ رہا تو اور غلط فہمیاں بڑھیں
وہ بھی سنا ہے اُس نے جو میں نے کہا نہیں

یہ شعر انسانی تعلقات میں رابطہ کی اہمیت کو بیان کرتا ہے۔ بعض اوقات خاموشی مسائل حل کرنے کے بجائے مزید غلط فہمیوں کو جنم دیتی ہے:

اُڑنے دو پرندوں کو ابھی شوخ ہوا میں
پھر لوٹ کے بچپن کے زمانے نہیں آتے

اس شعر میں شاعر بچپن اور آزادی کی قدر و قیمت بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی کا یہ حسین دور دوبارہ واپس نہیں آتا، اس لیے اسے بھرپور انداز میں جینا چاہیے:

نہ جی بھر کے دیکھا نہ کچھ بات کی
بڑی آرزو تھی ملاقات کی

یہ شعر محبت میں ادھورے پن اور حسرت کی بہترین مثال ہے۔ شاعر کو محبوب سے ملاقات تو نصیب ہوئی، مگر دل کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔

بشیر بدر کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے اشعار عام زندگی کے تجربات سے جڑے ہوئے ہیں۔ وہ مشکل فلسفیانہ زبان کے بجائے سادہ الفاظ میں گہری بات کہہ دیتے ہیں، اسی لیے ان کے اشعار مشاعروں، ادبی محفلوں اور روزمرہ گفتگو تک میں کثرت سے نقل کیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر بشیر بدر نے رومانوی اشعار بھی خوب کہے ہیں:

وہ چاندنی کا بدن خوشبوؤں کا سایہ ہے
بہت عزیز ہمیں ہے، مگر پرایا ہے
اتر بھی آؤ، کبھی آسماں کے زینے سے
تمھیں خدا نے ہمارے لیے بنایا ہے

اسی طرح کے ایک اور رومانٹک شعر کا بھی ذکر ہو جائے:

سر سے پا تک، وہ گلابوں کا شجر لگتا ہے
باوضو ہو کے بھی چھوتے ہوئے ڈر لگتا ہے

ڈاکٹر بشیر بدر کا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا زمانۂ طالبِ علمی ان کی ادبی اور علمی زندگی کا نہایت اہم دور سمجھا جاتا ہے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ان کی شاعرانہ صلاحیتیں پوری طرح نکھر کر سامنے آئیں اور وہ اردو دنیا میں ایک نمایاں نام بننے لگے۔ بشیر بدر نے اپنی بی اے، ایم اے اور بعد ازاں پی ایچ. ڈی کی تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی۔ طالبِ علمی کے دوران وہ صرف ایک عام طالبِ علم نہیں تھے بلکہ ان کی غزلیں پہلے ہی ادبی رسائل میں شائع ہو رہی تھیں اور مشاعروں میں پسند کی جا رہی تھیں۔ ایم اے اردو کے زمانے میں ان کی ادبی شہرت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ ایک دلچسپ واقعہ اکثر بیان کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی غزلیں یونیورسٹی کے نصاب اور ادبی مطالعے میں شامل ہو گئی تھیں۔ جب انھوں نے ایم اے میں داخلہ لیا تو یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر امتحان میں ان کی اپنی شاعری سے متعلق سوال آ گیا تو کیا وہ اپنی ہی غزلوں کا امتحان دیں گے؟ اس صورتِ حال کے باعث ان کے لیے علاحدہ سوالیہ پرچہ تیار کیا گیا۔ بعد میں انھوں نے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور یونیورسٹی میں اعلا پوزیشن بھی حاصل کی۔ کچھ اسی طرح کی دلچسپ صورتِ حال سے اردو کی نامور محبتوں اور خوشبوؤں کی شاعرہ پروین شاکر کو بھی دوچار ہونا پڑا تھا، جب وہ پاکستان سپیریئر سروسس کے امتحان میں اردو کا پرچہ لکھنے پہنچیں تو انھیں اپنی ہی شاعری کو لے کر ایک سوال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ تعلیمی اعتبار سے بھی ڈاکٹر صاحب نہایت ذہین طالبِ علم تھے۔ ایم اے کے دوران انھوں نے نمایاں نمبر حاصل کیے اور انھیں تعلیمی امتیازات اور انعامات بھی ملے، جن میں 'سر ولیم مورس ایوارڈ' اور 'رادھا کرشن ایوارڈ' ہیں۔ علی گڑھ کا علمی اور ادبی ماحول ان کی شخصیت پر گہرا اثر چھوڑ گیا۔ اس دور میں وہ اردو کے بڑے اساتذہ، ادیبوں اور شاعروں کی صحبت میں رہے۔ یونیورسٹی کے مشاعرے، ادبی نشستیں اور علمی مباحث ان کی فکری تربیت کا اہم ذریعہ بنے۔ یہی ماحول بعد میں ان کی شاعری کی سادگی، فکری پختگی اور جدید اسلوب کی بنیاد بنا۔ انھوں نے اپنی تحقیقی دلچسپی کو بھی جاری رکھا۔ 'آزادی کے بعد کی اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ' کے موضوع پر پی ایچ. ڈی مکمل کی۔ یہ مقالہ انجمن ترقی اردو (ہند) نے پہلے 1981 میں اور دوبارہ 2023 میں اہتمام سے شائع کیا، جس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ اگرچہ یہ ڈاکٹریٹ ڈگری انھیں کئی دہائیوں بعد باضابطہ طور پر ملی (پورے 47 سال بعد)، لیکن ان کی تحقیق، اردو تنقید میں ایک اہم علمی کام سمجھی جاتی ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تدریس کے دوران وہ نہ صرف ایک استاد کے طور پر معروف تھے بلکہ ایک ابھرتے ہوئے شاعر کی حیثیت سے بھی ان کی شہرت بڑھ رہی تھی۔ ان کی غزلیں ادبی رسائل میں شائع ہو رہی تھیں اور مشاعروں میں بے حد پسند کی جاتی تھیں۔ یونیورسٹی کا علمی و ادبی ماحول ان کی شخصیت اور شاعری دونوں کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا رہا۔ بعد ازاں انھوں نے میرٹھ کالج میں بطورِ لکچرر شمولیت اختیار کی۔ وہاں وہ اردو شعبے کے سربراہ بھی رہے اور تقریباً 17 برس تک تدریسی و انتظامی خدمات انجام دیتے رہے۔ بشیر بدر کی تدریسی زندگی کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ صرف نصابی تعلیم تک محدود نہیں تھے بلکہ طلبہ میں ادب، شاعری اور تنقیدی شعور پیدا کرنے پر بھی زور دیتے تھے۔ اسی وجہ سے انھیں اردو ادب میں ایک کامیاب استاد، محقق اور شاعر تینوں حیثیتوں سے یاد کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر بشیر بدر کا تعلق ایک تعلیم یافتہ اور باوقار خاندان سے تھا۔ ان کے والد سیّد محمد نظیر پولیس محکمے میں اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ تھے اور اپنے علاقے میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ والدہ کا نام عالیہ بیگم تھا۔ بشیر بدر اپنے والدین کی کئی اولادوں میں چوتھے نمبر پر تھے۔ ڈاکٹر بشیر بدر نے دو شادیاں کی تھیں۔ ان کی پہلی شادی میرٹھ میں ہوئی تھی۔ اس شادی سے ان کے ہاں دو بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئے، جن میں نصرت بدر، معصوم بدر اور صبا بدر کے نام ملتے ہیں۔ بعد میں زندگی کے ایک مشکل دور، خصوصاً 1987 کے میرٹھ فسادات اور ذاتی صدمات کے بعد ان کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ میرٹھ کے فسادات میں ان کا گھر، کتابیں اور بہت سا ادبی سرمایہ جل کر ضائع اور خاک ہو گیا تھا۔ اس سانحے نے ان کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا:

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

بعد ازاں وہ بھوپال منتقل ہو گئے تھے، جہاں ان کی ملاقات ڈاکٹر راحت بدر سے ہوئی۔ ڈاکٹر راحت نے مشکل حالات میں ان کا حوصلہ بڑھایا اور دوبارہ ادبی سرگرمیوں کی طرف آنے میں ان کی مدد کی۔ بعد میں ان دونوں کی شادی بھی ہوئی۔ ڈاکٹر راحت بدر سے ان کے ایک بیٹے طیب بدر ہیں۔ بشیر بدر کی فیملی ان کی زندگی میں ایک اہم سہارا رہی، خاص طور پر ان مشکل حالات میں جب انھوں نے فسادات، مالی نقصان اور ذاتی صدمات کا سامنا کیا۔ ان کے اہلِ خانہ نے ان کی ادبی زندگی کے تسلسل اور بحالی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے علمی ماحول، ممتاز اساتذۂ اردو اور کلاسکی و جدید شعری روایت نے مل کر ڈاکٹر بشیر بدر کی ادبی شخصیت کی تشکیل و تکمیل میں نمایاں کردار ادا کیا۔

پروفیسر آل احمد سرور کا ڈاکٹر بشیر بدر کی ادبی اور فکری تشکیل پر اثر مانا جاتا ہے۔ آل احمد سرور بنیادی طور پر شاعر سے زیادہ ایک استاد، نقاد اور محقق تھے۔ ان کی تنقید کا ایک اہم اصول یہ تھا کہ ادب کو زندگی، سماج اور انسانی تجربے سے جڑا ہونا چاہیے۔ بشیر بدر کی غزلوں میں بھی یہی خصوصیت نمایاں نظر آتی ہے۔ روایتِ عشق کے ساتھ جدید انسانی مسائل کی عکاسی، سادہ مگر فکری زبان، انسانی رشتوں اور معاشرتی تبدیلیوں کا شعور، جدید حسیت اور کلاسکی روایت کا امتزاج ہو۔ مثال کے طور پر بشیر بدر کا یہ شعر اس کی عکاسی کرتا ہے:

...(بقیہ صفحہ 8 پر)

# غزل کی زبان کو دوشیزگی بخشنے والا فن کار: بشیر بدر

پروفیسر منظر حسین

بشیر بدر کا شمار ان فنکاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو کی شعری روایت سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے منفرد لب و لہجے، زبان و بیان کے تخلیقی برتاؤ، نئی حسیت، طرز احساس کی ندرت کے ساتھ ساتھ جدیدیت کے اکتساب کے حوالے سے اپنے تخلیقی سفر کو ایک سماجی ذمہ داری کے طور پر قبول کیا ہے اور معنی و مفاہیم کے نئے امکانات روشن کیے ہیں۔ ان کی شاعری آزمودہ کار پختہ ذہن کی شاعری ہے۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن ان کی شاعری 'گفتگو باز نان کردن' تک محدود نہیں بلکہ غزلوں میں ان کا عہد باتیں کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ بشیر بدر نے اپنی بات کو اپنے لہجے میں ادا کیا ہے جس کے مطالعے سے اس نکتے کا انکشاف ہوتا ہے کہ انھیں لفظ کے تخلیقی امکانات کا نیا عرفان و ادراک بھی تھا اور کلاسکی شعری روایات کا فنی شعور بھی۔

بشیر بدر کا پورا نام سید محمد بشیر اور تخلص بدرؔ تھا۔ ان کی پیدائش 15 فروری 1935 کو فیض آباد کے گاؤں میں ہوئی جوان کا آبائی وطن ہے۔ والد کا نام سید محمد نظیر اور والدہ کا نام عالیہ بیگم تھا۔ اسلامیہ کالج اٹاوہ سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا رخ کیا۔ ایم۔ اے اردو تک کی تعلیم اسی یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ایم.اے (اردو) امتحان میں فرسٹ کلاس حاصل کر کے گولڈ میڈل اور رادھا کرشن پرائز کے مستحق ہوئے۔ اس دوران انھوں نے 1969 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مجلّے 'علی گڑھ میگزین' کی ادارت بھی کی۔ ایک خصوصی شمارہ غالب نمبر کو ترتیب و تزئین کر کے زیورِ طبع سے آراستہ کیا۔ انھوں نے 'آزادی کے بعد کی اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد بحیثیت لکچرر ان کی تقرری شعبہ اردو میرٹھ یونیورسٹی میں ہوئی۔ جہاں 1994 تک اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ بشیر بدر کو اپنے جس پہلے شعر پر اپنے والد کی خفگی کا شکار ہونا پڑا وہ یوں ہے:

ہوا چل رہی ہے اڑا جا رہا ہوں
ترے عشق میں مرا جا رہا ہوں

بشیر بدر کے شعری مجموعوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ (1) اکائی (غزلوں کا مجموعہ، 1969)، (2) امیج (غزلوں کا مجموعہ، 1973)، (3) آمد (غزلوں کا مجموعہ، 1985)، (4) آس، (5) آہٹ، (6) کلیاتِ بشیر بدر، (7) کوئی شام گھر بھی رہا کرو۔ ان کے علاوہ نثری تصنیف (1) آزادی کے بعد کی اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ اور (2) بیسویں صدی میں اردو غزل قابلِ ذکر ہیں۔ ہندی میں بھی نصف صدی سے زیادہ کتابیں شائع ہوئیں، مثلاً (1) تمھارے لیے، (2) اجالے اپنی یادوں کے، (3) آنچ، (4) دھوپ کی بتیاں ہزار بن، (5) افیکشن، (6) آس، (7) 'کلچر یکساں' وغیرہ۔

بشیر بدر کو ملک اور بیرونی ممالک میں کئی ادبی انعامات و اعزازات سے نوازا گیا۔ ان میں 1985 میں امتیاز میر، 1999 میں پدم شری کے علاوہ بہت سارے انعامات و اعزازات ہیں۔ 2000 میں مجلس ادب دوحہ قطر نے جشن کا اہتمام کیا۔ مختلف تنظیموں اور اداروں سے بھی وابستہ رہے۔ مشاعرے کو ایک نیا کلچر دیا۔ مشاعرے کو مقبولیت اور شہرت عطا کرنے میں بشیر بدر کا کلیدی کردار رہا ہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بشیر بدر نے بھوپال میں مستقل طور پر سکونت اختیار کی۔ ان کا انتقال 28 مئی 2026 بروز جمعرات عید قرباں کے دن بھوپال میں ہوا اور یہیں سپرد خاک ہوئے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے اور تمام لواحقین اور اردو کے قارئین و مشاعرے کے سامعین کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین)

1960 کے بعد بشیر بدر غزل کی شاعری میں ایک نئی آن بان کے ساتھ منظرِ عام پر آئے۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں حسی محاکات کا جوش بھی ہے اور فکر و احساس کی آمیزش بھی۔ بشیر بدر نے جس زمانے میں اپنی شاعری کا آغاز کیا اس وقت ترقی پسندی محض اشتراکیت کے ہم معنی ہو کر رہ گئی تھی، جس کے نتیجے میں اردو شاعری لہجے کی گھن گرج، مقصدیت، توضیح پسندی، معروضیت، برہنہ گفتاری اور اجتماعیت کی گونج کا شکار ہو رہی تھی۔ یہ زمانہ جدیدیت کے شباب کا تھا۔ جدیدیت کا رجحان دراصل کسی تحریک، منشور یا لائحہ عمل کی تبلیغ و توسیع نہیں بلکہ اس کی بنیاد فنکار کے انفرادی مزاج، احساسات و تجربات اور عصری حقائق کو براہ راست تخلیقی سطح پر برتنے کی کوشش پر ہے۔ 1969 میں ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ 'اکائی' شائع ہوا۔ اس مجموعے کی غزلوں پر جدیدیت کے اثرات پورے طور پر نمایاں ہیں لیکن ہمیں اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ انھوں نے غزل کی قدیم روایتوں سے کبھی انحراف نہیں کیا بلکہ ہمیشہ پاسداری کی۔ ساتھ ہی عصری زندگی کی حسیت سے بھی نا آشنا نہیں رہے اور پڑھنے والوں کو بھی الفاظ کی تخلیقی لذت اور غزلوں کے لہجے میں نیا پن اور آگہی کا احساس دلایا۔ اپنی غزلوں کے وسیلے سے المناک کیفیات کو تخلیقی تجربے کا حصہ بنانے کا ہنر بشیر بدر کو خوب آتا ہے۔ میرٹھ کے فسادات نے بشیر بدر کو مضمحل ضرور کیا تھا لیکن کرب و اضطراب کے اظہار میں جھنجھلاہٹ نہیں بلکہ جذبے کی صداقت کو دخل ہے۔ اشعار دل سے نکلتے ہیں اور دلوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں تصنع، بناؤ سنگار کا شائبہ تک نہیں بلکہ آمد اور بیساختگی کی کیفیت زیادہ ہے۔ ان کے فکری زاویے کی تفہیم کے لیے چند اشعار پیش ہیں۔ ان اشعار میں جذبات و احساسات کا زیر و بم بھی ہے اور فکر و آگہی کی بشارت بھی۔ الفاظ کا تخلیقی حسن بھی ہے اور جدید لہجے کی ترجمانی بھی:

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے پاس رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہوجائے

---

محبت، عداوت، وفا، بے رخی
کرایے کے گھر تھے بدلتے رہے

بس ایک شام کی لذت بہت غنیمت ہے
عظیم پاک محبت کسی کے بس کی نہیں

---

ابھی اس طرف نہ نگاہ کر، میں غزل کی پلکیں سنوار لوں
مرا لفظ لفظ ہو آئینہ تجھے آئینے میں اتار لوں

---

مسافر ہیں ہم بھی مسافر ہو تم بھی
کسی موڑ پر پھر ملاقات ہوگی

---

جسے لے گئی ہے ابھی ہوا وہ ورق تھا دل کی کتاب کا
کہیں آنسوؤں سے لکھا ہوا کہیں آنسوؤں سے مٹا ہوا

---

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

---

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

یہ تمام اشعار مشت نمونہ از خروارے کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ ان اشعار میں بول چال کی زبان کو وسیلہ بنایا گیا ہے۔ تمام اشعار فنکار کے تخیل کی جسارت اور طبیعت کی مہم پسندی کے ترجمان ہیں۔ لہجے کی شاعرانہ دلکشی شاعری کی شعریت اور طہارت کو نقصان پہنچنے نہیں دیتی۔ ان اشعار میں شعری کمال کی صناعی بھی ہے۔ معنی آفرینی، سادگی اور بیساختگی بھی۔ پہلے شعر کا خطابیہ لہجہ فنکار کے جذبات و احساسات کی لہروں کے ساتھ ساتھ فکری بصیرت کا اشاریہ بن گیا ہے۔ 'اجالے اپنی یادوں کے ہمارے پاس رہنے دو' کی آواز فنکار کے اپنے تجربے کی آواز ہے جس کو دوسرے مصرعے 'نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے' سے تقویت بخشی گئی ہے۔ اس شعر میں عصری حسیت کا اکتساب بھی ہے اور تعمق بھی۔ بشیر بدر اپنے عہد کی تمام خوفناکیوں، سفاکیوں نیز تہذیبی و ثقافتی اقدار کی شکست و ریخت کو رومانی اور رجائی لب و لہجہ میں اجاگر کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ دوسرے شعر میں جو بے تکلفی ہے، زندگی کے ایک خاص تجربے کا ادراک ہی نہیں کراتی بلکہ آگہی اور بصیرت کا احساس بھی دلاتی ہے۔ شعر کا دوسرا مصرع 'کرایے کے گھر تھے بدلتے رہے' اس صورتِ حال کی نمائندگی کرتا ہے جس میں اداسی بھی ہے اور طنز بھی۔ یہ مصرع پہلے مصرعے کو تقویت بخشتے ہوئے واحد متکلم کے احتساب اور آگہی پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ تیسرا شعر مفہوم کی ترسیل سے زیادہ فنی ہنرمندی کی نشاندہی کرتا ہے۔ شعر کے دوسرے مصرعے 'عظیم پاک محبت کسی کے بس میں نہیں' میں جو تیقن اور اعتماد ہے، پہلے مصرعے 'بس ایک شام کی لذت بہت غنیمت ہے' واحد متکلم کے تجربات اور امکانات کو اپنے اندر ضم کرنے اور سمونے کے مترادف ہے۔ دوسرے تمام اشعار بھی اپنے مفاہیم و علائم کے اعتبار سے کئی سطحوں پر قاری کو

متوجہ کرتے ہیں۔ یہ تمام اشعار نئی ترکیبوں، الفاظ کی شفافیت اور اسلوب کی ندرت کی بدولت قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتے۔ ان اشعار میں ابلاغ وترسیل کا بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ جذبات کی پیشکش میں بھی ان کا رویہ سنبھلا ہوا اور معتدل ہے۔ بشیر بدر کے مذکورہ تمام اشعار احساس کی صداقت، تخیل کی نزاکت اور شخصیت کی پُرخلوص آنچ سے مزین ہیں۔ غم واندوہ میں بھی وہ حوصلہ نہیں ہارتے بلکہ رجائیت اور مایوسی کے امتزاج سے امید اور جدوجہد کا رویہ رکھتے ہیں۔ گردوپیش کی حقیقتیں ان کے احساس کو مجروح ضرور کرتی ہیں لیکن ان کے یہاں کوئی ہیجان نظر نہیں آتا بلکہ ان کے احساسات وخیالات کی سطح پُرسکون نظر آتی ہے جو ہمیں غور وفکر پر اکساتی ہے۔ خصوصاً درج ذیل دو اشعار کی حیثیت ان کی شاعری کی شاہ کلید (Master Key) ہوگئی ہے:

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

---

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملوگے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

عشق اور معاملات عشق انسان کی ضرورت بھی ہے اور جبلت بھی۔ اردو غزل اپنے ابتدائی دور سے ہی عشقیہ جذبات، احساسات و تجربات کا آئینہ دار رہی ہے۔ عشق کا موضوع ہماری شعری روایت کا ایک اہم حصہ ہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ کلاسکی شعرا کے یہاں جو عشق کا تصور اور عشق کی کارفرمائیاں تھیں اب جدید عہد میں قصۂ پارینہ ہوگئی ہیں۔ مثالی عشق اور مثالی عاشق کا تصور ناپید ہو چکا ہے۔ آج کے عہد میں اردو شاعری کے محبوب کے رویے میں کافی تبدیلی آئی ہے۔ آج کا محبوب شہری تمدن، انتشار وافراتفری کی بھیڑ میں اگر گم ہوگیا ہے تو اس کا ڈھونڈ پانا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد جدید کا عاشق اپنے محبوب کے بچھڑ جانے پر کف افسوس نہیں ملتا، آنسو نہیں بہاتا، آہ وگریہ و زاری نہیں کرتا بلکہ کسی دوسرے محبوب کی تلاش میں نکل جاتا ہے یا آہستہ آہستہ تنہائیوں کو اپنا رفیق اور غمگسار بنا لیتا ہے۔ اب نہ تو کلاسکی غزل کی طرح عاشق ہجر کے کرب سے گزرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی وصل کی خواہش اسے ستاتی ہے۔ آج کا محبوب محض Time Pass کی ضرورت بن کر رہ گیا ہے۔

بشیر بدر کی شاعری میں عشق کے جذبات، کیفیات و واردات کا اظہار مختلف رنگ میں پوری آب وتاب کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ وہ پڑھنے والے کو سرشاری محبت کی ایسی مسحور کن کیفیات سے ہمکنار کرتے ہیں کہ پڑھتے ہوئے خاصا لطف آتا ہے۔ ان کے یہاں عشق کا اپنا ایک تصور ہے جو ان کی جرأت اور دلیری کا ضامن ہے۔ یہ اشعار دیکھیے:

وہی خط کہ جس پہ جگہ جگہ دو مہکتے ہونٹوں کے چاند تھے
کسی بھولے بسرے سے طاق پر تہِ گرد ہوگا دبا ہوا

---

سب کھلے ہیں کسی کے عارض پر
اس برس باغ میں گلاب کہاں

---

کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی
یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا

---

اب ملے ہم تو کئی لوگ بچھڑ جائیں گے
انتظار اور کرو اگلے جنم تک میرا

---

اتنی ملتی ہے مری غزلوں سے صورت تیری
لوگ تجھ کو مِرا محبوب سمجھتے ہوں گے

---

میرے ہونٹوں پہ تیری خوشبو ہے
چھو سکے گی انھیں شراب کہاں

ان اشعار میں غزل کی تہذیب اور روایت کا پاس بھی ہے اور عشق کے جذبات واحساسات کا ترفع بھی۔ انھوں نے اپنی عشقیہ شاعری میں عشق کی کیفیت کا اظہار جس صداقت سے کیا ہے اور وفا کو جولب ولہجہ عطا کیا ہے اس کے لیے کسی سے شہادت یا سند لینے کی ضرورت نہیں۔ پہلے شعر میں حافظے کے حوالے سے محبوب کی ذات کو مرکزِ نگاہ بنایا گیا ہے جس میں شفافیت (Transparacy) ہے جو ہماری توجہ کو اپنے اندر جذب کر رہی ہے۔ دوسرا شعر شاعر کے احساس جمال پر دلالت کرتا ہے۔ لفظوں کے انتخاب اور حسن ترتیب سے معنی کے انوکھے پہلو پیدا کیے گئے ہیں۔ تیسرے شعر میں فنکار کی مثبت سوچ اور تعمیری رویہ بولتا ہوا نظر آتا ہے۔ بات اتنی سادگی اور سچائی سے کہی گئی ہے کہ قاری کے دل و دماغ کو متاثر کرتی ہے۔ چوتھے شعر میں بشیر بدر کی جرأت گفتار قابلِ ستائش ہے جو دراصل صلابت کردار کا ہی ایک روپ ہے۔ 'انتظار اور کرو اگلے جنم تک میرا' کی معنی خیزی پڑھنے والے کو متاثر کرتی ہے۔ پانچویں شعر میں چہکتے مہکتے لفظوں سے داخلی کیفیت کو اشاروں اشاروں میں بیان کیا گیا ہے جس میں حلاوت بھی ہے اور شیرینی بھی۔ دلداری اور دلبری بشیر بدر کی عشقیہ شاعری کے اوصاف ہیں۔ آخری شعر میں بدن کی جمالیات کو شامی پیکر 'خوشبو' کے توسط سے اجاگر کیا گیا ہے جس میں ایک کھلا پن بھی ہے اور کھلے پن کا رکھ رکھاؤ بھی۔ 'چھو سکے گی انھیں شراب کہاں' میں جو تیقن ہے، فنکار کے بیانیے کو استناد بخشتا ہے۔

بشیر بدر کو نئی غزل کی لفظیات پر بڑی حد تک عبور حاصل ہے اور یہی ہنرمندی ان کے اسلوب کی کلید ہے۔ وہ الفاظ کے مزاج کو پہچاننے اور شاعرانہ قوت کے ساتھ استعمال کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں ہوا، جگنو، گھر، دھوپ، شام، گاؤں کی لفظیات تخلیقی حسن کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ انھیں اپنی مٹی کی سوندھی خوشبو اور گاؤں کی معصوم زندگی بہت عزیز ہے اور یہ تمام الفاظ فنکار کے تجربات کے عمق اور مشاہدات کے تنوع کے امین ہیں۔ یہ اشعار دیکھیے:

دھوپ کھیتوں میں اتر کر زعفرانی ہوگئی
سرمئی اشجار کی پوشاک دھانی ہوگئی

---

چڑھا کے پیٹھ پہ بکری کے بچے گھر میں گئے
یہ دنیا اب ہمیں سرکس کا شیر کردے گی

---

پیچھے پیچھے رات تھی تاروں کا اک لشکر لیے
ریل کی پٹڑی پہ سورج چل رہا تھا رات کو

---

ہم دلّی بھی آئے ہیں لاہور بھی گھومے
اے یار مگر تیری گلی تیری گلی ہے

---

پکے گیہوں کی خوشبو چیختی ہے
بدن اپنا سنہرا ہو چکا ہے

اب بشیر بدر کے چند ایسے اشعار ملاحظہ فرمائیں جو ہمیں محظوظ بھی کرتے ہیں اور متوجہ بھی۔ ساتھ ہی دعوت فکر بھی دیتے ہیں:

دشمنی جم کر کرو لیکن یہ گنجائش رہے
جب کبھی ہم دوست ہو جائیں تو شرمندہ نہ ہوں

---

انڈا مچھلی چھو کر جن کو پاپ لگے
ان کا پورا ہاتھ لہو میں ڈوبا ہے

بشیر بدر نے ہندوستانی تہذیب اور فلسفے کو ہندی لفظیات، ہندوستانی تلمیحات سے مزین کر کے معنی ومفاہیم کے نئے نئے دریچے وا کیے ہیں اور فنی چابکدستی کا ثبوت فراہم کیا ہے:

گیلے گیلے مندروں میں بال کھولے دیویاں
سوچتی ہیں ان کے سورج دیوتا کب آئیں گے

---

پربت پربت، بادل بادل، کرن کرن
اجلے پر والے دو پنچھی ہم دونوں

---

بات کیا ہے کہ مشہور لوگوں کے گھر
موت کا سوگ ہوتا ہے تیوہار سا

بشیر بدر کی غزلیہ شاعری کے مجموعی تجزیے کے بعد میں جس نتیجے پر پہنچا ہوں یقیناً اس سے آپ بھی اتفاق کریں گے۔ میں اپنی اس رائے پر سو فیصد قائم ہوں کہ بشیر بدر اردو کا وہ فن کار ہے جس نے غزل کی زبان کو دوشیزگی بخشی ہے اور مشاعرے کے ماحول کو مقناطیسیت بھی۔ مشاعروں کی ایسی ہی فضاؤں نے انھیں پسندیدہ شاعر بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

سابق ڈین فیکلٹی آف ہیومنٹیز وصدر شعبۂ اردو، رانچی یونیورسٹی، رانچی
موبائل: 8210470292

1960 کے بعد بشیر بدر غزل کی شاعری میں ایک نئی آن بان کے ساتھ منظرِ عام پر آئے۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں حسی محاکات کا جوش بھی ہے اور فکر واحساس کی آمیزش بھی۔ بشیر بدر نے جس زمانے میں اپنی شاعری کا آغاز کیا اس وقت ترقی پسندی محض اشتراکیت کے ہم معنی ہو کر رہ گئی تھی، جس کے نتیجے میں اردو شاعری لہجے کی گھن گرج، مقصدیت، توضیح پسندی، معروضیت، برہنہ گفتاری اور اجتماعیت کی گونج کا شکار ہو رہی تھی۔ یہ زمانہ جدیدیت کے شباب کا تھا۔ جدیدیت کا رجحان دراصل کسی تحریک، منشور یا لائحہ عمل کی تبلیغ وتوسیع نہیں بلکہ اس کی بنیاد فنکار کے انفرادی مزاج، احساسات وتجربات اور عصری حقائق کو براہ راست تخلیقی سطح پر برتنے کی کوشش پر ہے۔ 1969 میں ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ 'اکائی' شائع ہوا۔ اس مجموعے کی غزلوں پر جدیدیت کے اثرات پورے طور پر نمایاں ہیں لیکن ہمیں اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ انھوں نے غزل کی قدیم روایتوں سے کبھی انحراف نہیں کیا بلکہ ہمیشہ پاسداری کی۔ ساتھ ہی عصری زندگی کی حسیت سے بھی ناآشنا نہیں رہے اور پڑھنے والوں کو بھی الفاظ کی تخلیقی لذت اور غزلوں کے لہجے میں نیاپن اور آگہی کا احساس دلایا۔ اپنی غزلوں کے وسیلے سے المناک کیفیات کو تخلیقی تجربے کا حصہ بنانے کا ہنر بشیر بدر کو خوب آتا ہے۔ میرٹھ کے فسادات نے بشیر بدر کو مضمحل ضرور کیا تھا لیکن کرب واضطراب کے اظہار میں جھنجھلاہٹ نہیں بلکہ جذبے کی صداقت کو دخل ہے۔ اشعار دل سے نکلتے ہیں اور دلوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں تصنع، بناؤ سنگار کا شائبہ تک نہیں بلکہ آمد اور بے ساختگی کی کیفیت زیادہ ہے۔

# غزل کی نئی خوشبوؤں کا شاعر: بشیر بدر

سراج زیبائی

**جیلانی کامران** نے ’استانزے‘ کے پیش لفظ میں کہا تھا کہ ’باسی زبان، آزمائی ہوئی ترکیبیں ، ہزار مرتبہ دوہرائے ہوئے استعارے پامال بندشیں کچھ ایسا آہنگ ترتیب دیتی ہیں کہ کان جھنجھلا جاتے ہیں۔ ہماری شاعری کا سب سے بڑا المیہ سکہ بند زبان کا المیہ ہے‘۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو ڈاکٹر بشیر بدر کا لہجہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ان کا لب ولہجہ یقیناً بہت بلند وبانگ ہے۔وہ بڑے طمطراق سے شعر کہتے ہیں۔ان کی شاعری اس لیے کامیاب ہے کہ موصوف کو نئی اور خوب صورت لفظیات اور انھیں سلیقے سے برتنے کا ہنر آتا ہے، جبھی تو ان کا ہر شعر سامعین کے دلوں کی دھڑکن بن جاتا ہے۔ بشیر بدر نے اپنی شاعری میں ہمیشہ فکر کے مثبت رویوں کی ترجمانی کی اور بڑی ہی سچی اور اچھی شاعری کی ہے۔ان کے قلم پر ہمارے عہد کے اردو ادب کو یقیناً فخر ہے۔ان کی شاعری کا تیکھا لہجہ اور نشتریت سب کے دلوں میں پیوست ہوجاتی ہے۔ ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ ڈاکٹر بشیر بدر اپنی آواز کے گراف پر خاصا کنٹرول رکھتے ہیں اور سامعین کے دلوں میں گھر کر لیتے ہیں۔ان کی شاعری مشاعروں اور رسالوں میں یکساں طور پر مقبول ہوئی ہے۔وہ اس وجہ سے کہ انھیں اس معیار کے شعر کہنے کا سلیقہ آتا ہے۔اس میں جو چیز شاعر کا معیار بڑھاتی ہے وہ ہے ان کا منفرد لب ولہجہ۔ وہ جب مشاعروں کے اسٹیج پر آتے ہیں تو آپ کو سامعین ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ پہلے وہ چند شعر پڑھ کر سامعین کے مزاج کا اندازہ لگا لیتے ہیں اور پھر اس نہج کی شاعری پیش کرتے ہیں تو صفیں الٹنے لگتی ہیں اور داد وتحسین سے چھتیں اڑنے لگتی ہیں۔ نہایت شائستگی متانت اور پورے وقار کے ساتھ اور ترنم سے شعر پڑھتے ہیں تو مشاعرے لوٹ لیتے ہیں۔ کہتے ہیں:

پھول سا کچھ کلام اور سہی
اک غزل اس کے نام اور سہی

موصوف کے لبوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ پھر دلوں کو بھی موم کر دیتی ہے:

پتھر مجھے کہتا ہے مرا چاہنے والا
میں موم ہوں اس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا

ڈاکٹر صاحب کی فطرت میں مَیں نے جو خاص خوبی دیکھی وہ یہ کہ ان کے دل میں ادب اور ادبی شخصیتوں کا حد درجہ احترام ہوتا ہے، جبھی تو وہ جہاں بھی جاتے ہیں انھیں چاہنے والوں کی محبتیں ان کا استقبال کرتی ہیں۔فرماتے ہیں:

محبت ایک خوشبو ہے ہمیشہ ساتھ چلتی ہے
کوئی انسان تنہائی میں بھی تنہا نہیں ہوتا

بدر صاحب کے کلام کو پڑھ کر ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کا شعری کینوس کس قدر وسیع ہے۔ان کے کلام میں کیسی ہمہ گیری ہے اور انہوں نے اپنی شاعری میں اجتماعی زندگی کی خامیوں پر کس طرح انگشت نمائی کی ہے۔کہتے ہیں:

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

---

کس کے آنسو چھپے ہیں پھولوں میں
چومتا ہوں تو ہونٹ جلتے ہیں

صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو بشیر بدر غزل ہی کے بلند پایہ شاعر ہیں۔ان کا کلام اس حیثیت سے اپنی الگ شناخت رکھتا ہے کہ انھوں نے ہمیشہ اپنی شاعری کو تخلیقی آب ورنگ دینے کی کوشش کی ہے اور بالکل الگ تھلگ اور اچھوتے خیالات کو شعری پیراہن عطا کیا ہے، اسی لیے ان کی شاعری میں ہمیں تخلیقی زرخیزی دیکھنے کو ملتی ہے۔جو خاص چونکا دینے والا وصف ہمیں ان کی شاعری میں نظر آتا ہے وہ ان کا اچھوتا اظہار ہے۔ ان کی شاعری کا امتیاز یہ ہے کہ ان کے اکثر شعر صوفیانہ جذب ومستی کی فضاؤں میں لے جاتے ہیں اور ذہن ودل میں سرشاری کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔اس طرح ان کی شاعری تاثر آفرینی کی ہمہ جہت تصویر پیش کرتی ہے:

کتابیں رسالے نہ اخبار پڑھنا
مگر دل کو ہر رات اک بار پڑھنا

غرض غزل کے تعلق سے خود بشیر بدر کا قول ہے غزل کا فن پھول کی پتیوں پر چاندنی کے قلم کی کہانی لکھنے کا فن ہے۔

کھلے سے لان میں سب لوگ بیٹھیں چائے پئیں
دعا کرو کہ خدا ہم کو آدمی کر دے

اکثر کالجوں میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں دیکھا گیا کہ جب ڈاکٹر صاحب اپنے اشعار پیش کرتے تو لڑکے اور لڑکیاں اپنی ڈائریوں میں موصوف کے شوقیہ اشعار بڑے احترام سے نوٹ کر لیا کرتے تھے:

سوکھے ہوئے گلاب کتابوں سے پھینک کر
برسوں کا پیار آپ نے پل میں جدا کیا

---

پڑھائی لکھائی کا موسم کہاں
کتابوں میں خط آنے جانے لگے

---

> صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو بشیر بدر غزل ہی کے بلند پایہ شاعر ہیں۔ ان کا کلام اس حیثیت سے اپنی الگ شناخت رکھتا ہے کہ انھوں نے ہمیشہ اپنی شاعری کو تخلیقی آب و رنگ دینے کی کوشش کی ہے اور بالکل الگ تھلگ اور اچھوتے خیالات کو شعری پیراہن عطا کیا ہے، اسی لیے ان کی شاعری میں ہمیں تخلیقی زرخیزی دیکھنے کو ملتی ہے۔ جو خاص چونکا دینے والا وصف ہمیں ان کی شاعری میں نظر آتا ہے وہ ان کا اچھوتا اظہار ہے۔ ان کی شاعری کا امتیاز یہ ہے کہ ان کے اکثر شعر صوفیانہ جذب و مستی کی فضاؤں میں لے جاتے ہیں اور ذہن و دل میں سرشاری کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔

مجھ کو شام بتا دیتی ہے
تم کیسے کپڑے پہنے ہو

ہمارے کالج کے زمانے میں ہم اپنے محبوب شاعر ساحر، فیض، احمد فراز وغیرہ کے علاوہ ڈاکٹر بشیر بدر کی پوئٹری بھی اکثر پڑھا کرتے تھے۔ان کی شاعری پڑھ کر ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی تھیں۔ہم حیرت واستعجاب میں پڑ جاتے کہ اتنے new thoughts ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں کیسے آجاتے ہیں۔ان کا لہجہ بھی کس قدر تیور دار ہوتا ہے۔ان دنوں پڑھے ہوئے شعروں کی گونج ان کی Symphony آج بھی ہم محسوس کرتے ہیں اور ہم نے اپنے اس مضمون میں جابجا ہی اشعار کوٹ کیے ہیں:

گلابوں کی طرح شبنم میں اپنا دل بھگوتے ہیں
محبت کرنے والے خوب صورت لوگ ہوتے ہیں

---

لہجہ کہ جیسے صبح کی خوشبو اذان دے
جی چاہتا ہے میں تری آواز چوم لوں

---

مجھے خدا نے غزل کا دیار بخشا ہے
یہ سلطنت میں محبت کے نام کرتا ہوں

---

تجھے بھول جانے کی کوششیں کبھی کامیاب نہ ہوسکیں
تری یاد شاخ گلاب ہے جو ہوا چلی تو لچک گئی

ڈاکٹر صاحب ایسے ہی خوب صورت مہکتے ہوئے اشعار لکھ کر فرماتے ہیں:

چمکتی ہے کہیں صدیوں میں آنسوؤں سے زمیں
غزل کے شعر کہاں روز روز ہوتے ہیں

---

اتنی ملتی ہے مری غزلوں سے صورت تیری
لوگ تجھ کو مرا محبوب سمجھتے ہوں گے

ایسے اشعار دیکھنے میں کتنے سیدھے سادے لگتے ہیں، لیکن انھیں پڑھ کر قاری چونک جاتا ہے۔شعروں کے موضوعات کا تنوع، منفرد لب ولہجہ ہی ہے جو دلوں میں خوشبوئیں بکھیرتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ موصوف کی پُرکشش شاعری نے ایک عہد کو متاثر کیا ہے۔سماج کے جبر واستحصال اور ناانصافیوں کے خلاف بشیر بدر نے ہمیشہ آواز اٹھائی ہے یہ اشعار دیکھیں:

پتھر کے جگر والو غم میں وہ روانی ہے
خود راہ بنالے گا بہتا ہوا پانی ہے

---

اسے کسی کی محبت کا اعتبار نہیں
اسے زمانے نے شاید بہت ستایا ہے

---

سات صندوقوں میں بھر کر دفن کر دو نفرتیں
آج انساں کو محبت کی ضرورت ہے بہت

---

ایسے ملو کہ اپنا سمجھتا رہے سدا
جس شخص سے تمھارا دلی اختلاف ہے

چاہے وہ درد کی باتیں ہوں یا خوشیوں کا ذکر بشیر بدر نے ہمیشہ نغمگی کی فضا برقرار رکھتے ہوئے حسی پیکروں کی ... (بقیہ صفحہ 8 پر)

# ادبی دُنیا کی مختلف تنظیموں اور شخصیات کا بشیر بدر کے انتقال پر اظہارِ تعزیت

## انجمن ترقی اردو (ہند):

نئی دہلی۔(یکم جون)۔معروف اردو شاعر، نقاد اور دانشور بشیر بدر کے انتقال پر انجمن ترقی اردو (ہند) کے دفتر میں ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں اردو زبان وادب کے لیے ان کی گراں قدر خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔انجمن کے جنرل سکریٹری اطہر فاروقی نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ بشیر بدر اپنے عہد کے مقبول ترین شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔انھوں نے غزل خوانی کے منفرد انداز اور الفاظ کے موثر اُتار چڑھاؤ کے ذریعے مشاعروں میں سامعین کو مسحور کیا۔ان کے متعدد اشعار عوامی زبان کا حصہ بن گئے اور آج بھی بے حد شوق سے پڑھے اور سنے جاتے ہیں۔انھوں نے مرحوم کے اہلِ خانہ اور اُردو برادری سے تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بشیر بدر کی رحلت اردو ادب کا ایک بڑا نقصان ہے۔

قابلِ ذکر ہے کہ ڈاکٹر بشیر بدر کو جدید اردو ادب میں ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل تھا۔ وہ نہ صرف اپنی نسل کے نمایاں اور مقبول شاعروں میں شامل تھے بلکہ اردو غزل کے ارتقا اور اس کی روایات کے سنجیدہ ناقد بھی تھے۔ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور پدم شری سمیت متعدد باوقار اعزازات سے نوازا گیا۔

جب بشیر بدر نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں اردو کی اعلا تعلیم کے لیے داخلہ لیا تو ان کی شاعری اُس وقت یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہو چکی تھی۔انھیں 'آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ' کے عنوان سے تحقیقی مقالے پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی تھی۔ یہ تحقیقی کام بعد میں انجمن ترقی اردو (ہند) نے 1981 میں شائع کیا اور پھر 2023 میں اس کا دوسرا اڈیشن منظرِ عام پر آیا۔اردو تنقید اور غزل کی تاریخ میں اس کتاب کو ایک اہم ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔

بشیر بدر کی یہ تحقیق تقریباً ایک دہائی کے مطالعے اور مشاہدے کا حاصل تھی، جس میں 1947 کے بعد اردو غزل کی فکری، فنی اور جمالیاتی جہتوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔انھوں نے ہندستان اور پاکستان کے شعری منظرنامے کا مطالعہ کرتے ہوئے جدید غزل کے بدلتے ہوئے رجحانات کو علمی اور تنقیدی انداز میں پیش کیا۔تعزیتی نشست کے اختتام پر انجمن ترقی اردو (ہند) کی جانب سے ڈاکٹر بشیر بدر کو بھرپور خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔مقررین نے کہا کہ اردو زبان وادب کے لیے ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی اور اردو دنیا انھیں مدتوں فراموش نہیں کر سکے گی۔

## پروفیسر اخترالواسع:

نئی دہلی (29 مئی)۔پدم شری پروفیسر اخترالواسع نے ممتاز شاعر بشیر بدر کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان کی رحلت اردو شاعری کے لیے ہمارے دور کا سب سے بڑا نقصان ہے۔انھوں نے کہا کہ ابھی اہلِ ادب فاروق سیّد کے انتقال کے صدمے سے باہر بھی نہیں نکل پائے تھے کہ بشیر بدر کی وفات کی خبر نے پوری ادبی دنیا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔پروفیسر اخترالواسع نے کہا کہ بشیر بدر کی شاعری سہلِ ممتنع کا بہترین نمونہ تھی۔انھوں نے اپنے منفرد اسلوب، سادہ مگر اثرانگیز زبان اور گہرے احساسات کے ذریعے اردو ادب کو بے پناہ سرمایہ عطا کیا۔ان کے اشعار عوام وخواص دونوں میں یکساں مقبول تھے اور محبت، جدائی، درد اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتے تھے۔انھوں نے بتایا کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں بشیر بدر ہمارے سینئر تھے۔ پی ایچ.ڈی مکمل کرنے کے بعد انھوں نے میرٹھ یونیورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دیں اور ایک ایسی نسل تیار کی جس نے اردو زبان کے فروغ اور ارتقا میں نمایاں کردار ادا کیا۔اخترالواسع نے مزید کہا کہ میرٹھ کے فسادات (1987) کے دوران بشیر بدر کا گھر اور قیمتی کتب خانہ نذرِ آتش ہو گیا تھا جب کہ اس سانحے سے قبل (1984) میں ان کی اہلیہ کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ان المناک حادثات کا درد اُن کی شاعری میں بار بار محسوس کیا جا سکتا ہے۔انھوں نے کہا کہ بشیر بدر کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اور اردو ادب میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

(انقلاب۔دہلی)

## انجمن ترقی اردو (شاخ دہلی):

نئی دہلی۔انجمن ترقی اردو (دہلی شاخ) کی جانب سے عہدِ حاضر کے ممتاز شاعر، ادیب اور دانشور جناب بشیر بدر کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا گیا۔اس موقعے پر انجمن کے ذمے داران اور اراکین نے مرحوم کی ادبی، شعری اور تنقیدی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور ان کے لیے دعاے مغفرت کی۔ انجمن کے صدر اقبال مسعود فاروقی نے اپنے تعزیتی بیان میں کہا کہ بشیر بدر اردو غزل کے ایک درخشاں ستارے تھے جنھوں نے اپنی منفرد شاعری، سادہ مگر پراثر اسلوب اور انسانی اقدار کے فروغ کے ذریعے اردو ادب کو نئی جہت عطا کی۔ان کے انتقال سے اردو دنیا ایک ایسے تخلیق کار سے محروم ہو گئی ہے جس کی کمی مدتوں محسوس کی جائے گی۔انجمن کے سکریٹری ادریس احمد نے اپنے تاثرات میں کہا کہ بشیر بدر کی شاعری محبت، رواداری اور انسانی رشتوں کی ترجمان تھی۔ ان کا کلام عوام وخواص دونوں میں یکساں مقبول رہا اور آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔انھوں نے کہا کہ مرحوم کی ادبی خدمات اردو زبان وادب کے تاریخ ساز اثاثے کے طور پر ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔انجمن کے جنرل سکریٹری خورشید عالم نے اپنے تعزیتی کلمات میں کہا کہ بشیر بدر نے اردو غزل کو نئی معنویت اور عصری حسیت عطا کی۔ان کی شخصیت نہایت شفیق، منکسرالمزاج اور ادب دوست تھی۔ ان کا انتقال اردو ادب کا ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔انھوں نے مرحوم کے اہلِ خانہ، شاگردوں اور مداحوں سے دلی تعزیت کا اظہار کیا۔ اجلاس کے اختتام پر مرحوم بشیر بدر کے لیے دعاے مغفرت کی گئی اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی گئی کہ وہ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل نصیب کرے۔

## غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی:

نئی دہلی (8 جون)۔غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کی جانب سے اردو کے ممتاز شاعر، غزل کے عہد ساز فنکار اور پدم شری اعزاز یافتہ ڈاکٹر بشیر بدر کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا گیا۔ڈاکٹر بشیر بدر 28 مئی 2026 کو بھوپال میں انتقال کر گئے۔ان کی وفات سے اردو ادب بالخصوص جدید غزل کا ایک روشن باب اختتام پذیر ہو گیا۔غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا ڈاکٹر بشیر بدر کی رحلت اردو زبان وادب کا ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے محبت، انسان دوستی، رواداری اور عصری حسیت کو جس خوب صورتی سے بیان کیا، اس سے آنے والی نسلیں فیض اٹھاتی رہیں گی۔ان کی غزلوں نے اردو شاعری کو عوامی سطح پر جو مقبولیت عطا کی وہ اب تاریخ کا ایک حصہ بن چکی ہے۔غالب انسٹی ٹیوٹ اس عظیم ادبی شخصیت کے انتقال پر ان کے اہلِ خانہ اور دنیا بھر کے ادب دوستوں سے دلی تعزیت کا اظہار کرتا ہے۔غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے اپنے تعزیتی کلمات میں کہا ڈاکٹر بشیر بدر صرف ایک شاعر نہیں بلکہ ایک تہذیبی اور ادبی روایت کے امین تھے۔ ان کے اشعار میں زندگی کے تلخ وشیریں تجربات، انسانی رشتوں کی نزاکت اور سماجی شعور کی گہری جھلک ملتی ہے۔ان کی وفات سے اردو دنیا ایک ایسے تخلیق کار سے محروم ہو گئی ہے جس کی آواز کئی دہائیوں تک ادب کے افق پر گونجتی رہے گی۔ واضح رہے کہ 2022 میں غالب انسٹی ٹیوٹ نے انھیں 'غالب ایوارڈ' پیش کیا تھا۔ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا کرے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل نصیب ہو۔غالب انسٹی ٹیوٹ کے ذمہ داران، تمام عملہ اور وابستگانِ ادب نے ڈاکٹر بشیر بدر کی ادبی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی بلندیِ درجات کے لیے دعا کی ہے۔

## ڈبلیو. بی. ایس. فاؤنڈیشن:

نئی دہلی (یکم جون)۔ ادب و ثقافت کے فروغ اور رفاہی خدمات میں سرگرم تنظیم ڈبلیو بی ایس فاؤنڈیشن نے اردو کے عہد ساز شاعر اور انسانی احساسات کے معتبر ترجمان بشیر بدر کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے۔تنظیم کے عہدیداران اور سرپرستوں نے اپنے تعزیتی پیغامات میں اسے اردو ادب کا ایک ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیا۔تنظیم کے سرپرست اور عالمی شہرت یافتہ شاعر پروفیسر وسیم بریلوی نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ بشیر بدر صرف ایک شاعر نہیں تھے بلکہ وہ انسانی رشتوں کی لطافت کے سفیر تھے۔ان کی شاعری نے شکستہ دلوں کو حوصلہ دیا، بکھرتے رشتوں کو زبان دی اور زندگی کے تلخ ترین لمحات میں بھی امید کے چراغ روشن رکھے۔ان کا اسلوب آنے والی نسلوں کے لیے چراغِ راہ رہے گا۔انھوں نے کہا کہ بشیر بدر کے جانے سے اردو شاعری کا ایک ایسا باب بند ہوا ہے جس کی بازگشت صدیوں تک سنائی دیتی رہے گی۔

ڈبلیو بی ایس فاؤنڈیشن کے صدر ڈی ڈی کوشک نے بشیر بدر کے انتقال کو اردو ادب کے لیے ایک بڑا سانحہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ بشیر بدر کی شاعری محبت، انسانیت اور سماجی ہم آہنگی کا استعارہ تھی۔ان کے اشعار ہر طبقے کے دل کی آواز بن گئے تھے۔تنظیم کے نائب صدر، سینئر صحافی اور ہندی 'دینک ہندوستان' کے مینیجنگ اڈیٹر پرتاپ سوم ونشی نے اپنے بیان میں کہا کہ بشیر بدر نے غزل کو جدید احساسات اور عام آدمی کے جذبات سے جوڑا۔ان کے اشعار زبان وادب کی سرحدوں سے آگے بڑھ کر انسانی جذبات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ڈبلیو ڈی ایس فاؤنڈیشن کے جنرل سکریٹری نیرج جین نے کہا کہ بشیر بدر کی شخصیت اور فن ہمیشہ ادب کے طلبہ اور نوجوان شاعروں کے لیے مشعلِ راہ رہیں گے۔ان کی شاعری آنے والی نسلوں میں زندہ رہے گی۔

معروف صحافی وشاعر معین شاداب نے بشیر بدر کے انتقال کو ایک عہد کے اختتام کے مترادف بتایا۔انھوں نے کہا کہ بشیر بدر نے عشقیہ جذبات اور انسانی رشتوں کے احساس کو جس نزاکت اور سادگی سے بیان کیا، وہ اردو شاعری کا ایک منفرد حوالہ ہے۔ڈبلیو بی ایس فاؤنڈیشن نے مرحوم کے اہلِ خانہ، چاہنے والوں اور پوری ادبی دنیا سے تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور انھیں جنت الفردوس عطا فرمائے۔آمین! (سیاسی تقدیر۔دہلی)

## قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان:

نئی دہلی (5 جون)۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے صدر دفتر میں معروف جدید شاعر و ناقد ڈاکٹر بشیر بدر کے انتقال پر تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا۔اس موقعے پر ادارے کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے اظہارِتعزیت کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر بشیر بدر ایک مایۂ ناز شاعر تھے۔ان کی شاعری جدید معاشرے کی خوبصورت ترجمانی کرتی ہے۔انسانوں سے ہمدردی، محبت اور زندگی کے گہرے مسائل ان کی شاعری کا امتیازی وصف ہیں۔

واضح رہے کہ ڈاکٹر بشیر بدر طویل علالت کے بعد 28 مئی 2026 کو بھوپال میں انتقال کر گئے۔اس وقت ان کی عمر 91 برس تھی۔ بشیر بدر نے زندگی کا ایک طویل حصہ شعروادب کی خدمت میں گزارا۔ مشاعروں میں ان کی شرکت مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت تھی۔ان کے متعدد اشعار ایسے ہیں جو ہر خاص و عام کی زبان پر محاورہ کی طرح ازبر ہیں۔ان کے شعری مجموعوں میں اکائی، آس، امید، امیج وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔اس کے علاوہ 'بیسویں صدی میں اردو غزل' اور 'آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ' جیسی کتابیں ان کی تنقیدی صلاحیتوں کا مظہر ہیں۔ ڈاکٹر بشیر بدر کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ہندستان کے اہم شہری اعزاز پدم شری سے نوازا گیا۔اس کے علاوہ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور دیگر کئی اعزازات سے بھی انھیں سرفراز کیا گیا ہے۔ایسے مقبول شاعر کا رخصت ہونا یقیناً قابل افسوس ہے۔امید ہے نئی نسل بشیر بدر کی کاوشوں سے مستفید ہوتی رہے گی۔

## بزمِ میکش، آگرہ:

آگرہ (29 مئی)۔اردو ادب کے عظیم شاعر بشیر بدر کے انتقال کے بعد آگرہ کی ادبی فضا غمزدہ ہوگئی ہے۔عید کے روز ان کے انتقال کی خبر جیسے ہی شہر میں پھیلی، ادبی حلقوں، شائقینِ مشاعرہ اور اردو زبان سے محبت رکھنے والوں میں افسوس کی لہر دوڑ گئی۔ بشیر بدر اگرچہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے مگر ان کی شاعری، لہجہ، مسکراتا چہرہ اور دل میں اُتر جانے والے اشعار ہمیشہ آگرہ کی یادوں میں زندہ رہیں گے۔آگرہ کی محفلوں میں جب بھی ان کے اشعار گونجتے ہیں تو شہر کی ادبی فضا مہک اٹھتی ہے۔تاج مہوتسو اور سورسدن میں منعقد ہونے والے مشاعروں سے لے کر سینٹ جانس کالج کے شعبۂ اردو کی محفلوں اور ہندکل چترانشی کے مشاعروں تک بشیر بدر کی موجودگی ہر تقریب کو یادگار بنا دیتی تھی۔ ان کی شاعری میں ایسی مٹھاس، درد اور سادگی تھی جو سامعین کے دلوں کو چھو لیتی تھی۔ بزمِ میکش کے سرپرست اجمل علی شاہ اور ایوانِ میر کے شاہد ندیم اکبرآبادی نے بشیر بدر کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی مغفرت کی دعا کی۔ چترانشی تنظیم کے جنرل سکریٹری امیر احمد کے مطابق بشیر بدر کے لیے آگرہ صرف ایک شہر نہیں بلکہ روحانی اور ادبی وابستگی کا مرکز تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ جب بھی آگرہ آتا ہوں تو اس کی مٹی میں میر تقی میر، مرزا غالب اور نظیر اکبرآبادی کی شاعری کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ وہ آگرہ کو اردو ادب کی سب سے تابناک سرزمین تصور کرتے تھے۔امیر احمد نے بتایا کہ بشیر بدر کا آگرہ سے تعلق صرف مشاعروں تک محدود نہیں تھا بلکہ یہ محبت، خلوص اور ادبی ورثے سے جڑا ہوا تھا۔یہی وجہ تھی کہ مصروفیات کے باوجود آگرہ سے ملنے والی دعوت کو وہ کبھی ٹالتے نہیں تھے۔ان کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی اس کی سادگی تھی۔انھوں نے اردو شاعری کو مشکل الفاظ کے حصار سے نکال کر عام آدمی کے دل کی آواز بنا دیا۔ان کی غزلیں پڑھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی انسان اپنے ہی دل کی بات سن رہا ہو۔بشیر بدر کا آگرہ کینٹ ریلوے اسٹیشن سے بھی جذباتی تعلق تھا۔ان کے بھائی ریلوے میں ملازم تھے اور اسٹیشن کے احاطے میں رہائش پذیر تھے۔بشیر بدر جب بھی آگرہ آتے تو مشاعرے سے پہلے یا بعد میں اپنے بھائی سے ضرور ملاقات کرتے، اسی لیے آگرہ ان کے لیے صرف ایک ادبی مرکز نہیں بلکہ ایک اپنائیت بھرا گھر بھی تھا۔ آگرہ میں منعقد ہونے والے مشاعروں سے ان کے کئی یادگار تجربات وابستہ تھے۔ ہوٹل گرانڈ میں منعقدہ ایک عظیم الشان مشاعرے میں انھوں نے ایسی غزلیں سنائیں کہ سامعین رات گئے تک محفل میں موجود رہے۔ ان کی آواز میں ٹھہراؤ، لہجے میں مٹھاس اور اشعار میں درد کی کیفیت سامعین کو مسحور کر دیتی تھی۔تاہم تاج مہوتسو کے دوران سورسدن میں منعقد ہونے والا ایک مشاعرہ ان کے لیے یادگار اور افسوسناک بھی ثابت ہوا، جب اچانک ان کی طبیعت بگڑ گئی۔اُس وقت معروف شاعر راحت اندوری بھی اسٹیج پر موجود تھے مگر بشیر بدر اپنی غزلیں مکمل نہ سنا سکے اور مشاعرہ درمیان میں ہی ختم کرنا پڑا۔اس رات شائقین اپنے محبوب شاعر کو مکمل طور پر نہ سن پانے کا افسوس لیے واپس لوٹے تھے۔ آگرہ کی ادبی شخصیات نے بشیر بدر کے انتقال کو اردو ادب کا ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیا ہے۔اتر پردیش ہندی سنستھان کے ساہتیہ بھوشن ایوارڈ یافتہ ادیب سشیل سریت نے کہا کہ بشیر بدر اپنے عہد کے عظیم ترین شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔ان کے انتقال سے اردو ادب میں ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جو شاید کبھی پُر نہ ہو سکے۔ (انقلاب۔دہلی)

## بزمِ خواجہ جاوید اختر، کاکی نارہ:

کاکی نارہ۔ بزمِ خواجہ جاوید اختر، کانکی نارہ کے زیرِ اہتمام مورخہ 31 مئی 2026 کی صبح ساڑھے دس بجے تا ساڑھے بارہ بجے ایک باوقار تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ یہ تقریب جدید اردو غزل کے مایہ ناز اور عہد ساز شاعر ڈاکٹر بشیر بدر کی یاد میں تعزیتی و دعائیہ محفل اور مرزاپور (یوپی) سے تشریف لائے سینئر شاعر جناب خورشید بھارتی (سابق مترجم، شعبۂ دیہی ترقی، حکومتِ اتر پردیش) کے اعزاز میں ایک شعری نشست پر مشتمل تھی۔اس کامیاب تقریب کا انعقاد کانکی نارہ حمایت الغربا ہائی اسکول میں قائم 'قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان' کے کمپیوٹر سنٹر میں عمل میں آیا۔نشست کی صدارت ادارے کے صدر جناب خواجہ احمد حسین (سابق رکن، مغربی بنگال اردو اکادمی) نے کی جب کہ نظامت کے فرائض کمپیوٹر سنٹر کے سابق سینئر فیکلٹی کم سپروائزر علی شاہد دلکش نے بہ حسن و خوبی انجام دیے۔مودبانہ انداز میں مہمانانِ گرامی کو شہ نشین پر مدعو کیے جانے کے بعد صدرِ محفل کے اعلان کی تمام شرکا نے پرجوش تائید کی۔ پروگرام کا باقاعدہ آغاز تلاوتِ کلام اللہ سے کرتے ہوئے مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے ڈاکٹر بشیر بدر، خواجہ جاوید اختر (علیگ)، ایوب انصاری (سابق ہیڈ ماسٹر، حمایت الغربا ہائی اسکول) اور ماسٹر ابوالکلام انصاری (سابق صدر کمپیوٹر سنٹر و سکریٹری اسکول ہذا) سمیت جملہ مرحومین کے لیے اجتماعی دعائے مغفرت فرمائی نیز ان کے درجات کی بلندی کی دعائیں کی گئیں۔تعزیتی نشست کی ادبی شروعات جناب عین۔سین کمال نے نعتِ سرورِ کونینؐ کے خوب صورت نذرانے سے کی۔اس کے بعد صدرِ محفل خواجہ احمد حسین نے ڈاکٹر بشیر بدر کی ایک مقبولِ عام غزل کو مرحوم ہی کے مخصوص طرز و ترنم میں پیش کر کے انھیں بہترین خراجِ عقیدت پیش کیا۔ مذکورہ اسکول کے سابق سینئر استاد و این سی سی افسر جناب عاطف جلیس نے ڈاکٹر بشیر بدر سے اپنی ذاتی ملاقات کا انکشاف کیا مزید تعزیتی گفتگو کے ساتھ اسلافِ اردو نیز اکابرینِ ملت کے نقشِ قدم پر چلنے کی بات کہی اور اردو کی بقا کے مثبت اقدام کا پیغام دیا۔اس موقعے پر علی شاہد دلکش نے گفتگو کی۔علاوہ ازیں معروف شاعر و صحافی مہتاب اسلم نے ڈاکٹر بشیر بدر کے ساتھ گزارے لمحات کو اپنے تاثرات میں شامل کیا۔

دوسرے سیشن میں اعزازی شعری نشست سجائی گئی، جس میں جناب سمیع الفت، احمد منیر، علی شاہد دلکش، بلند اقبال، مہتاب سلم، عظیم انصاری، صاحبِ نشست خورشید بھارتی اور صدرِ محترم خواجہ احمد حسین نے اپنے منتخب کلام سے محفل کو محظوظ کیا اور حاضرین و سامعین سے خوب داد و تحسین حاصل کی۔معزز سامعین کی صف میں حاجی عبدالغفار، ڈاکٹر جاوید اشرف (کولکاتہ)، محمد علی احمد (کولکاتہ)، ماسٹر محمد ممتاز، شمیم جہانگیری، صحافی شکیل اختر، حسرت جاوید (ڈائرکٹر آسرا کمپیوٹر سنٹر) اور محمد شمشاد سمیت کمپیوٹر سنٹر کے طلبہ و طالبات کی بڑی تعداد موجود تھی۔ پروگرام کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں راقم الحروف، محترمہ فردوس جبیں (سنٹر سپروائزر اور کمپیوٹر ٹیچر)، محمد صغیر احمد (اردو ٹیچر) اور محمد عبدالستار نے کلیدی اور انتظامی کردار ادا کیا۔ ◆◆


**انجمن ترقی اردو (ہند) کی اہم کتاب**

# آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ

## بشیر بدر

- بشیر بدر برِّصغیر ہندوپاک ہی نہیں، عالمی سطح پر مشاعروں کی دنیا کی ان نابغۂ روزگار شخصیتوں میں سے ہیں جن کی شاعری نے مشاعروں میں شرکت کرنے والے ان کے ساتھی شعرا کے ساتھ مشاعروں کی بنیادوں کو بھی زیروزبر کر دیا تھا۔وہ تقریباً نصف صدی تک اردو غزل کے بانکپن سے سرشار گیسوے غزل کو سنوارتے رہے۔ بلاشبہ ان کا عہد مشاعروں کا ایک زرّیں عہد رہا ہے۔بشیر بدر نے نثر میں بھی اپنی تحقیقی و تنقیدی عظمتوں کے اہم نقوش چھوڑے ہیں۔ان کا تحقیقی مقالہ 'آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ' ایک ایسی ہی کتاب ہے۔ یہ کتاب پہلے 1981 میں طبع ہوئی تھی، اس کا دوسرا اڈیشن 2023 میں نہایت خوب صورت انداز میں شائع کیا گیا ہے۔
- انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی ہر عہد کی ایسی ہی شخصیتوں کی نادر تحقیقی و تنقیدی تحریروں کو اردو ادب کے عام قاری تک اپنے نفیس اور پُرکشش انداز میں پہنچانے کے لیے ہمیشہ سرگرم رہی ہے۔بشیر بدر کی کتاب 'آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ' اپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت اہم اور مفید کتاب ہے جس کی ایک دستاویزی حیثیت ہو گئی ہے۔
- بشیر بدر کی یہ کتاب اساتذہ اور طلبہ کے ساتھ ساتھ منفرد موضوعات کا مطالعہ کرنے اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے عام قاری کے لیے بھی مفید اور کارآمد ہے۔

ضخامت: 343 صفحات —— قیمت: 500 روپے

# میں تھک گیا ہوں ہوا سے کہو بجھائے مجھے

(بقیہ صفحہ 2 سے آگے)

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملوگے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے، ذرا فاصلے سے ملا کرو

اس میں جدید معاشرتی رویّوں کا شعور ملتا ہے، جو اُس ادبی فضا سے ہم آہنگ ہے جسے علی گڑھ کے ناقدین، خصوصاً آل احمد سرور، فروغ دے رہے تھے۔ علی گڑھ کے علمی ماحول میں آل احمد سرور یقیناً ان کے بڑے اساتذۂ ادب اور فکری رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے۔ ادبی مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ علی گڑھ کے اُس دور کے اساتذہ، خصوصاً آل احمد سرور اور خلیل الرحمن اعظمی نے بشیر بدر سمیت پوری ایک نسل کی ادبی تربیت پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

ڈاکٹر بشیر بدر کو اپنی ادبی خدمات اور اردو شاعری میں غیر معمولی کردار کے اعتراف میں متعدد اعزازات اور انعامات سے بھی نوازا گیا ہے۔ ڈاکٹر بشیر بدر کو اردو ادب اور شاعری میں نمایاں خدمات کے اعتراف میں 1999 میں پدم شری سے نوازا گیا تھا۔ انھیں ان کے معروف شعری مجموعے ’آس‘ پر اردو زبان کا ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ (1990) دیا گیا تھا، جو ہندستان کے سب سے معتبر ادبی اعزازات میں شمار ہوتا ہے۔ ’ریختہ‘ کے مطابق انھیں اتر پردیش اردو اکادمی کی جانب سے چار مرتبہ اعزازات اور انعامات سے بھی نوازا گیا تھا۔ انھیں بہار اردو اکیڈمی کی جانب سے بھی اعزاز دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو کم از کم سات بڑے اعزازات ملے تھے، جب کہ اس کے علاوہ مختلف ادبی تنظیموں، مشاعروں، جامعات اور ثقافتی اداروں کی جانب سے بھی انھیں متعدد اعزازی اسناد اور اعزازات سے نوازا گیا تھا۔ ڈاکٹر بشیر بدر کے بارے میں اکثر ناقدین یہ رائے دیتے ہیں کہ ان کی اصل پہچان صرف ایوارڈز نہیں بلکہ ان کے وہ اشعار ہیں جو عوام کی زبان کا حصہ بن گئے ہیں، اسی لیے ان کی ادبی مقبولیت کو ان کے اعزازات سے بھی بڑا سرمایہ سمجھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر بشیر بدر نے اپنی ادبی زندگی میں متعدد بیرونی ممالک کے سفر بھی کیے تھے۔ خصوصاً، بین الاقوامی مشاعروں اور ادبی تقریبات کے سلسلے میں۔ ادبی حلقوں میں یہ بات معروف ہے کہ بشیر بدر ہندستان کے اُن اردو شعرا میں شمار ہوتے تھے جنھوں نے بیرونِ ملک اردو مشاعروں میں وسیع پیمانے پر شرکت کی اور ان کا کلام امریکہ، خلیجی ممالک، برطانیہ اور دیگر اردو دوست ممالک میں بھی بے حد مقبول تھا۔

ادبی ذرائع کے مطابق ان کے کم از کم 7 معروف شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ان کے نمایاں شعری مجموعے یہ ہیں۔ اکائی، امیج، آمد، آہٹ، آس، آسمان، اللہ حافظ۔ اس کے علاوہ ان کا کلیات بھی شائع ہوا تھا جس میں ان کے مختلف مجموعوں کا منتخب کلام یکجا کیا گیا ہے۔ بعض ذرائع خصوصاً ’ریختہ‘ پر ان کی 24 ای- کتابوں کا ذکر ملتا ہے، لیکن ان میں شعری مجموعوں کے ساتھ تنقیدی، تحقیقی اور مرتبہ کتابیں بھی شامل ہیں، اس لیے ان سب کو شعری مجموعے نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے سب سے زیادہ مشہور شعری مجموعوں میں آس، آہٹ، آمد، امیج اور آسمان خاص طور پر اردو قارئین میں مقبول رہے ہیں۔ ڈاکٹر بشیر بدر کی شاعری کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاتا ہے کہ ان کے متعدد اشعار زبان زدِ عام بن گئے ہیں۔ حتّٰی کہ پارلیمنٹ کے ایوانوں میں بھی سیاست داں اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے بشیر بدر کے اشعار گنگناتے نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے کئی مجموعے بار بار شائع ہوتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر بشیر بدر نے اپنی زندگی میں سیکڑوں غزلیں کہیں، لیکن ان کی کل غزلوں کی درست تعداد کہیں مستند طور پر درج نہیں ہے۔

ڈاکٹر بشیر بدر جدید اردو غزل کے اہم ترین شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی وفات پر ہندستان اور بیرونِ ملک ادبی حلقوں، شاعروں، فنکاروں اور لاکھوں مداحوں نے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ ہم بھی انھیں، ناصر کاظمی کے الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں:

تو شریک سخن نہیں ہے تو کیا
ہم سخن تیری خامشی ہے ابھی

یاد کے بے نشاں جزیروں سے
تیری آواز، آرہی ہے ابھی

شہر کی بے چراغ، گلیوں میں
زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی

جاوید وِلا، گراؤنڈ فلور، مکان نمبر 12-2-419/A/3/1
الاپتی نگر، مہدی پٹنم، حیدرآباد-500028 (تلنگانہ)
Mob. No. +91 6309727951
E-mail: abuumarsiddiqi@gmail.com

# غزل کی نئی خوشبوؤں کا شاعر: بشیر بدر

(بقیہ صفحہ 5 سے آگے)

تخلیق کی ہے۔ ان کی شاعری سے ہمیں زندگی کی مثبت قدروں کی جانب رہنمائی ملتی ہے۔ اردو واقعی بڑی عظیم اور میٹھی زبان ہے جو دکھوں کو مسکراہٹوں میں تبدیل کرتی ہے۔ اردو غزل کو ڈاکٹر بشیر بدر نے آذر کی طرح تراشا ہے اور ایسی تاثیر پیدا کی ہے کہ جو غزل کے شائقین کا دل موہ لیتی ہے۔ ان کی غزلوں میں جو کسک اور درد ہے جو ٹیس ہے وہ سینے میں تیر کی طرح پیوست ہو جاتی ہے۔ اس ضمن میں یہ خوب صورت شعر ملاحظہ ہو:

دشمنی جم کر کرو لیکن یہ گنجائش رہے
جب کبھی ہم دوست ہو جائیں تو شرمندہ نہ ہوں

اور پھر یہ شعر:

آنکھوں میں رہا دل میں اتر کر نہیں دیکھا
کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا

بشیر بدر کی شاعری آنسوؤں کے ساتھ تحریر ہوتی ہے۔ جذب و جنوں کی کیفیت شاعر پر طاری ہوتی ہے تو شعر خلق ہوتے ہیں۔ جناب بشیر بدر صداقتوں کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں المنا کی بھی ہے، محرومیت بھی اور مہر و وفا کی نرمیاں بھی۔ ان کی غزلیہ شاعری کے چند خوش رنگ نمونے ملاحظہ ہوں جن میں کئی موضوعات کی خوشبوئیں ہیں:

مخالفت سے مری شخصیت سنورتی ہے
میں دشمنوں کا بڑا احترام کرتا ہوں

جس دن سے چلا ہوں مری منزل پہ نظر ہے
آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

ہم بھی دریا ہیں ہمیں اپنا ہنر معلوم ہے
جس طرف بھی چل پڑیں گے راستہ ہو جائے گا

وہ شاخ ہے نہ پھول اگر تتلیاں نہ ہوں
وہ گھر بھی کوئی گھر ہے جہاں بچیاں نہ ہوں

گفتگو ان سے روز ہوتی ہے
مدتوں سامنا نہیں ہوتا

ایسے شعروں کی وسعت اور عمق ہماری روح کو غذا فراہم کرتی ہے اور اپنے تازہ اور نئے ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ پاکستانی شاعری ہندوستانی شاعری کے مقابلے میں کافی عمدہ ہوتی ہے۔ یہ قیاس بالکل غلط ہے۔ آج بھی ہمارے ملک میں بڑی تعداد میں کئی شعرا ایسے ہیں جن کی خوب صورت شاعری اچھی اور صحت مند شاعری کے خانے میں رکھی جاسکتی ہے۔ اس میں اظہار کا پیرایہ اصل چیز ہے اور ساتھ ہی اس کی مضمون آفرینی بھی اس کے حسن کو دوبالا کرتی ہے۔ بشیر بدر نے کبھی عامیانہ سطح کی شاعری نہیں کی۔ اپنے خاص معیار پر ثابت قدم رہے ہیں۔ یہی خوبی انھیں اپنے ہم عصروں میں امتیاز کا مرتبہ عطا کرتی ہے۔ ایسی شاعری کو پڑھ کر ہمارے دلوں سے یہ دعائیں نکلتی ہیں کہ ایسے شعرا اردو دنیا میں مزید نیک نامی حاصل کریں اور ان کی شاعری اردو کے ذخیرے میں اضافہ کرنے میں کامیاب ہو۔ ڈاکٹر صاحب کی شاعری میں کلاسکی شاعری اور جدید شاعری کا ایک خوب صورت امتزاج ملتا ہے۔ ڈاکٹر بشیر بدر کی کئی غزلیں مختلف غزل سنگروں نے اپنی مدھر آواز میں گائی ہیں اور دنیا بھر میں مقبول ہوئی ہیں۔ ان میں بھی انھوں نے وہی عمدہ لفظیات کی خوشبوئیں اور نئے افکار کے ذائقے بھر دیے ہیں جنھیں ہم آج بھی سنتے ہیں تو کانوں میں رس گھلتا ہے:

شہرت کی بلندی تو پل بھر کا تماشا ہے
جس ڈال پہ بیٹھے ہو وہ ٹوٹ بھی سکتی ہے

محبتوں میں دکھاوے کی دوستی نہ ملا
اگر گلے نہیں ملتا تو ہاتھ بھی نہ ملا

اس کی زلفیں بہت گھنیری ہیں
ایک شب کا قیام اور سہی

سر جھکاؤ گے تو پتھر دیوتا ہو جائے گا
اتنا مت چاہو اسے وہ بے وفا ہو جائے گا

ڈاکٹر بشیر بدر کی کئی شعری تصنیفات شائع ہو کر مقبول ہوئی ہیں، جیسے ’آس‘ 1993، ’اکائی‘ 1969، ’امیج‘ 1973 کے علاوہ بشیر بدر کی ’غزلیں‘ 2001، ’غزل یونیورس‘ 2003 اور ’نئی آواز‘ اور بشیر بدر پر بہت ساری کتابیں شائع ہوئیں۔ ان میں ’بشیر بدر: فن اور شخصیت‘ 1988، ’غزل کا اہم موڑ بشیر بدر‘ 2018 اور ’ڈاکٹر بشیر بدر کی غزلیں‘ 2005۔ بشیر بدر کو کئی اعزازات وانعامات سے نوازا گیا ہے۔ ان کی مجموعی خدمات کے صلے میں 1999 میں انھیں پدم شری ایوارڈ اور شعری تصنیف ’آس‘ کو ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ 1999 سے سرفراز کیا گیا۔ ڈاکٹر بشیر بدر کی مجموعی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے۔ ان کی پُرکشش شاعری نے ایک عہد کو متاثر کیا ہے۔ ان کی شاعری کا معیار ہمیشہ بلند رہے گا اور ان کی شاعری آسمانِ ادب پر تادیر ’بدرِ منیر‘ کی طرح چمکتی رہے گی۔

شیموگہ، کرناٹک
E-mail: sirajzebayi10@gmail.com
Mobile: 8296694020

# بشیر بدر اور اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ (بقیہ صفحہ 10 سے آگے)

رکھتی ہیں۔ آزادی اور حصولِ آزادی، [ان کا] محبوب موضوع ہے...جوش کی جذباتیت، نعرۂ انقلاب، غم و غصے کا اثر، ان شاعروں پر تو ہے ہی جو صرف تقلید کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں، ان کے علاوہ ایسے ذہین اور فطری نئے شاعر پر ان کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں، جنھوں نے محنت اور ریاضت سے اپنی راہ الگ نکال لی''۔(ایضاً، ص31)

بشیر بدر کی یہ تنقیدی نظر اپنی جانب متوجہ کرتی ہے اور اس جانب اشارے بھی کہ ترقی پسند غزل صرف اور صرف جذباتی نعروں سے مملو تھی، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ بشیر بدر جب ترقی پسند شاعری پر غزل کے اثرات کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کا مطمحِ نظر اس طرح سامنے آتا ہے:

''...ترقی پسند غزل کی عصریت اور اظہار میں وضاحت سے بالواسطہ متاثر ہونے والی اس غزلیہ شاعری میں جہاں ترقی پسند غزل کے کچھ موضوعات ملتے ہیں، وہیں وضاحت اور خطابت بھی ملتی ہے، اس کے ساتھ الفاظ کا روایتی سلیقہ، مانوس ہمواری، اقلیت اور اجتماعی احساسات کی مختلف جھلکیاں ملتی ہیں''۔(ایضاً، ص56)

بشیر بدر آگے مزید لکھتے ہیں:

''غزل ایک شعری رویے کا نام ہے۔ غزل کی شاعری کے لیے نہ ہی کچھ مضامین محدود و مخصوص ہیں اور نہ ہی ممنوع۔ جب ترقی پسند غزل اور اس سے متاثر ہونے والی شاعری کو غزل سے الگ بیان کرتے ہیں تو اس لیے نہیں کہ ترقی پسند غزل میں حسن و عشق، شاہد و شراب، لطف و نشاط کے بجائے جوش و انقلاب، بغاوت، جدو جہد یا عزم و عمل کا اظہار ہوتا ہے''۔
(ایضاً، ص56)

عزم و عمل کے اظہار کے لیے اپنی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے بشیر بدر نے لکھا ہے کہ حالی اور ان کے سلسلے کے کئی شاعروں اور نقادوں نے شعر میں 'مقصدیت' کو قدرِ اول بتایا اور یہ مقصدیت اخلاق کے تابع ہونی ضروری تھی۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مقصدی غزل کے ردِ عمل کے طور پر خالص غزل کا ایک محدود تصور بیسویں صدی کے ابتدائی حصے میں اُبھرا جو غزل کو صرف داستانِ حسن و عشق تک محدود کردیتا ہے۔(ایضاً، ص57) فیضؔ نے کیا خوب کہا ہے:

درِ قفس پہ اندھیروں کی مہر لگتی ہے
تو فیضؔ دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں

لیکن بشیر بدر کے ہاں اس مقصدی شاعری کا پرتو کہیں نظر نہیں آتا۔ بہت تلاش کے بعد ہی چند اشعار سامنے آئیں گے، جیسے:

ہم بھی دریا ہیں ہمیں اپنا ہنر معلوم ہے
جس طرف بھی چل پڑیں گے راستہ ہوجائے گا

بڑے لوگوں سے ملنے میں ہمیشہ فاصلہ رکھنا
جہاں دریا سمندر سے ملا دریا نہیں رہتا

یہاں لباس کی قیمت ہے آدمی کی نہیں
مجھے گلاس بڑے دے شراب کم کردے

ورنہ ان کے ہر ایک مجموعۂ کلام میں درج ذیل قبیل کے اشعار ہی ملیں گے:

تم مجھے چھوڑ کے جاؤ گے تو مر جاؤں گا
یوں کرو جانے سے پہلے مجھے پاگل کردو

سر جھکاؤ گے تو پتھر دیوتا ہوجائے گا
اتنا مت چاہو اسے وہ بے وفا ہوجائے گا

اگر آسماں کی نمائشوں میں مجھے بھی اذنِ قیام ہو
تو میں موتیوں کی دکان سے تری بالیاں ترے ہار لوں

لیکن اسی غزل میں ایک شعر ایسا بھی ہے جو ہمیں غزل کی اس روشنی کی جانب لے جاتا ہے جو مقصدی شاعری سے قریب کردیتی ہے:

کہیں اور بانٹ دے شہرتیں کہیں اور بخش دے عزتیں
مرے پاس ہے مرا آئینہ میں کبھی نہ گرد و غبار لوں

کتاب کا دوسرا حصہ 1952 سے 1960 تک محیط ہے۔ اس حصے میں غزل آفریں فضا، عصریت اور نئی حسیت، آزادی، فسادات، تنہائی اور بے تعلقی، نارسائی، ابدی اداسی، جدید عشقیہ شاعری، غزل کا نیا اسلوب اور غزل: روایت کی توسیع، تجدید اور تقلید وغیرہ کے تحت اردو غزل کے سفر کا محاکمہ کیا گیا ہے۔ 'غزل کا نیا اسلوب' کے ذیل میں بشیر بدر لکھتے ہیں:

''غزل میں تغزل کی اصطلاح اپنی تمام جامعیت اور خوبیوں کے باوجود بعض ذہنوں کے لیے جابرانہ حد تک ایسی روایتیں رکھتی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ نئے سے نئے اور انفرادی تجربے کو بھی چند مخصوص علائم میں ہی بیان کیا جاسکتا ہے''۔
(ایضاً، ص152)

اس بات کو پرکھتے ہوئے بشیر بدر نے کہا ہے کہ تغزل چند مقررہ رموز و علائم، تشبیہ و استعارے اور لفظیات کا نام نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ زبان کی تمام تبدیلیوں کو ہم نے دوسری اصناف کے لیے وقف کردیا اور غزل میں صدیوں پرانی لفظیات کو نئی معنویت کے ساتھ کبھی کبھی اور زیادہ تر تقلیدی شعرا کے ذریعے اس قدیم معنویت کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا۔ اس دور میں غزل کے احساس و اظہار میں نیا پن اس وجہ سے آیا ہے کہ نئے ذہن نے اجتماعی آواز کو اپنی آواز میں ڈھالنے کی بجائے اپنے طور پر آزادانہ سوچنے محسوس کرنے اور بیان کرنے کی ہمت کی۔(ایضاً، ص153) بشیر بدر کا ہی شعر ہے:

اب روئے کہاں ساون، اب تڑپے کہاں بادل
آنگن نہ بغیچہ ہے اک چھوٹا سا کمرہ ہے

ابر کے کھیت میں بجلی کی چمکتی ہوئی راہ
جانے والوں کے لیے راستہ بن جاتی ہے

بشیر بدر 'غزل آفریں فضا' میں رقم طراز ہیں:

''ترقی پسند نقادوں میں بیشتر غزل سے کسی نہ کسی وجہ سے خائف رہے۔ اگر سردار جعفری اس کی رمزیت اور اشاریت کو مقصدیت کی تبلیغ کے منافی سمجھتے ہیں تو محمد حسن اس کی مجموعی فضا میں متصوفانہ ایذا پسندی محسوس کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ترقی پسندی کے انقلابی ماحول میں یہ کتنا بڑا جرم ہے''۔
(ایضاً، ص94)

لیکن پروفیسر محمد حسن کے الفاظ میں:

''تیسری بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ ترقی پسندوں نے ادب میں سماجی شعور کی جو بات اٹھائی تھی، وہ سراسر بکواس تھی۔ شاعری کو سماجی بصیرت، فکر اور پیغام وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے''۔(ایضاً، ص92)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر محمد حسن اس کے موید نظر آتے ہیں۔ غزل بہر حال غزل ہے اور اس کو ایسے چکروں سے آزاد رہنا چاہیے جیسے احسان دانش نے کہا ہے:

جس نے اک احساں کیا اک بوجھ سر پر رکھ دیا
سر سے تنکا کیا اتارا سر پہ چھپر رکھ دیا

چھپر کا ایک خوب صورت استعمال افسر آغا لکھنوی نے بھی کیا ہے۔ شعر دیکھیں:

غزل کو برگد و چھپر سڑک کی بُو دے کر
شمیم زلفِ معطر کہاں سے لاؤ گے

ان متضاد خیالات کے باوجود غزل میں مقصدیت بھی اجاگر کی جارہی ہے اور تغزل کے بیش از بیش نمونے بھی وافر تعداد میں سامنے آتے رہے ہیں۔ بشیر بدر کا ہی ایک شعر ہے:

وہ چاندنی کا بدن خوشبوؤں کا سایہ ہے
بہت عزیز ہمیں ہے مگر پرایا ہے

لیکن ایک شعر یہ بھی ہے:

چہرے پہ آنسوؤں نے لکھی ہیں کہانیاں
آئینہ دیکھنے کا مجھے حوصلہ نہیں

کتاب کے تیسرے حصے میں 1961 سے 71-1970 تک کی شاعری پر جدیدیت کے حوالے سے بحث کی گئی ہے اور بشیر بدر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جدید غزل میں لاشعور کی بازآفرینی، پیکر تراشی، استعارے کی طرف جھکاؤ، خود میں اترنے کی وجہ سے ایک خود کلامی کا متفکرانہ احساس اور تجزیاتی تجسس کا عنصر ہوگا۔ اس کا اظہار تحت، لہجہ، خود کلامی اور سوچتی ہوئی بے چینی کے ساتھ ہوگا۔(ایضاً، ص304)

کتاب کا چوتھا حصہ 'جدید غزل، حال اور مستقبل' کے زیرِ عنوان ہے۔ اس باب میں بشیر بدر نے غزل میں عشقیہ اور جنسی شاعری کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے، لیکن اس شاعری میں جنس یا محبت پوری زندگی کے سیاق و سباق میں ہے، اس لیے اس دور کی تہ دار نفسیات، اس کی پیچیدگی، اس کی آلائشوں اور آسائشوں کی حسیت جدید عشقیہ اور جنسیہ اشعار میں بھی نمایاں ہے(ایضاً، ص34-333)۔ لیکن بشیر بدر یہ بھی کہتے ہیں کہ جدید غزل میں نئے انسان کی دریافت ہے۔ یہ انسان نظریوں اور سیاسی عقائد کا انسان نہیں بلکہ پوری زندگی کا انسان ہے۔ پوری زندگی میں تہذیبی لاشعوری، تاریخی تہذیبی شعور، جدید آگہی اور اس کی اجتماعی اور انفرادی زندگی سبھی کچھ آجاتے ہیں۔ اس میں تہذیب، ملک، مذہب، سیاسی رویّے سبھی کی گنجائش ہے، لیکن جدید غزل میں غزل کی اپنی قدریں اور ادبی و شعری معیار بھی بہت کچھ ہیں۔ ایک شعر دیکھیں:

بڑے لوگوں سے ملنے میں ہمیشہ فاصلہ رکھنا
جہاں دریا سمندر سے ملا دریا نہیں رہتا

لیکن یہ بات اپنی جگہ اٹل حقیقت ہے کہ جدید غزل میں روایتی غزل سے ہٹ کر بہت کچھ مختلف ہے، ساتھ ہی یہ بات بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ جدید غزل کسی بھی قسم کا لیبل اپنے اوپر قبول نہیں کرتی گویا یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ نہ جدید غزل پر کسی قسم کا لیبل لگایا جاسکتا ہے اور نہ وہ کسی ایک صفت یا کیفیت کے دائرے میں قید ہی کی جاسکتی ہے۔ جدید غزل کے علم برداروں کی اپنی اصطلاحات اور اپنے استعارے ہیں، وہ کہیں روایتی غزل سے میل بھی کھاسکتے ہیں اور کہیں اپنے الگ ہی انکشافات رکھتے ہیں۔

یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ بشیر بدر کی کتاب 'آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ' نہ صرف اس وقت تک جب یہ تصنیف کی گئی، اس کے بعد کے ادوار میں بھی غزل کے روایتی تجزیوں کے ساتھ ساتھ جدید غزل کے نئے ابعاد سے بھی متعارف کراتی ہے۔ اور یہ بہت بڑی خوبی کی بات ہے کہ کتاب جب رقم کی گئی اُس وقت کے تناظر میں تو لائقِ مطالعہ ہے ہی، اپنے بعد کے زمانے میں بھی قابلِ مطالعہ قرار پائے۔

N 93, 4th Floor, Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar, New Delhi-110025
Mob. No. 9873819521
E-mail: mh2kamal@gmail.com

# بشیر بدر اور اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ

ڈاکٹر منور حسن کمال

**بشیر بدر** (1935-2026) شعروادب کی دنیا میں اپنی ایک امتیازی شان رکھتے ہیں۔ وہ اپنی منفرد پیشکش، اندازِ شاعری اور لفظیات کے حوالے سے خوب پہچانے جاتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی شاعری میں ایسے ایسے نئے حسّی پیکر تراشے ہیں جو ان کی غزل کا حصہ بننے سے لے کر آج تک مقبول ومعروف رہے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق میر، علامہ اقبال اور غالب کے بعد اگر عام آدمی کو کسی کے اشعار زیادہ یاد ہیں تو ان میں صرف دو نام نظر آتے ہیں: ایک ہیں ساحر لدھیانوی اور دوسرے بشیر بدر، بلکہ بشیر بدر اپنے اشعار کی شہرتوں میں ساحر لدھیانوی سے آگے ہی ہیں۔ ان کی شاعری دلوں میں ایسے اتر تی گئی کہ لوگ ان کی نثری خدمات کو بالکل ہی فراموش کر بیٹھے ہیں۔

بشیر بدر کے پی ایچ.ڈی کے مقالے کا موضوع ’آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ‘ تھا۔ یہ کتاب انجمن ترقی اردو (ہند) سے شائع ہوئی اور خوب فروخت ہوئی۔ اس کتاب کا پہلا اڈیشن 1981 میں شائع ہوا تھا، جس کو اہتمام کے ساتھ انجمن ترقی اردو (ہند) نے شائع کیا تھا، جس کی خوب پذیرائی ہوئی اور بعض کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی کلّی یا جزوی طور پر شامل رہی ہے، بلکہ اس عہد کی غزل کی تنقید کے لیے اس کتاب کو ایک اہم حوالہ جاتی کتاب کی شکل میں بھی منفرد مقام حاصل ہے۔ بعض اساتذہ نے یہ بھی التزام کیا ہے کہ اس کتاب کو اپنے طلبہ کو سبقاً پڑھاتے رہے ہیں، جس سے ان کی علمی وادبی استعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوجاتا ہے۔ اس کتاب کا دوسرا اڈیشن نئی سج دھج اور اہتمام کے ساتھ 2023 میں شائع کیا گیا۔


مدیر : **اطہر فاروقی**

Editor : Ather Farouqui

شریکِ مدیر : محمد عارف خاں

Joint Editor : Mohd. Arif Khan

معاون مدیران: منور حسن کمال، سالم فاروق ندوی

Assisistant Editors :
Munawwar Hasan Kamal, Salim Farooq Nadwi

پرنٹر پبلشر : عبدالباری

Printer Publisher : Abdul Bari

مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-٦

مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002

Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002

قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر

Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722


بشیر بدر کی پی ایچ.ڈی کے پسِ پشت پروفیسر آل احمد سرور کا ہاتھ رہا ہے۔ دراصل بشیر بدر اپنی زندگی میں کئی نشیب وفراز سے گزرے ہیں۔ ان کے والد شاہ محمد نظیر محکمۂ انتظامیہ میں ایک پولیس اہلکار کے طور پر مامور تھے اور ان کے تبادلے بھی ہوتے رہتے تھے، اس لیے ان کی تعلیم کئی جگہوں پر ہوئی۔ اگر چہ ابتدائی تعلیم ان کے آبائی وطن فیض آباد (موجودہ ایودھیا) کے ایک گاؤں بکیا، میں ہوئی لیکن اس کے بعد انھوں نے تیسری جماعت تک حلیم مسلم کالج کانپور میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ان کے والد کا تبادلہ اٹاوہ ہوگیا اور بشیر بدر نے محمد صدیق اسلامیہ کالج اٹاوہ سے ہائی اسکول کیا۔ اسی دوران ان کے والد شاہ محمد نظیر کافی بیمار رہنے لگے اور طویل علالت کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کے بعد بشیر بدر کا تعلیمی سلسلہ منقطع ہوگیا۔ وہ گھر میں بڑے تھے اس لیے گھر کی تمام ذمے داریاں ان کے کاندھوں پر آ گئیں۔ انھیں محکمۂ انتظامیہ میں پولیس کی ملازمت مل گئی جو شاید 85 روپے ماہوار تھی۔ اس قلیل تنخواہ میں انھیں اپنے گھر کے اخراجات پورے کرنے پڑتے تھے۔ اس دوران وہ مشاعروں میں بھی شرکت کرنے لگے تھے۔ کچھ انتظامات وہاں سے ہوجاتے تھے، لیکن اس دوران ان کا تعلیمی سلسلہ کم وبیش پانچ برس تک موقوف رہا۔ جب ان کا تبادلہ سیتاپور ہوا تو وہ وہاں کی نشستوں میں شرکت کرنے لگے اور ان کے نئے انداز کے اشعار پسند کیے جانے لگے جہاں انھوں نے بزمِ سیتاپور کے بانی صدر مست حفیظ رحمانی کے ساتھ جامعہ اُردو علی گڑھ کے ادیب ماہر اور ادیب کامل کے امتحانات پاس کیے اور اول آنے پر میڈل بھی حاصل کیے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے اُردو کیا اور سالِ اول ودوم میں امتیازی نمبر حاصل کرنے پر میڈل سے نوازے گئے، پھر پروفیسر آل احمد سرور کی نگرانی میں پی ایچ.ڈی کی۔

جب ہم ان کی کتاب ’آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ‘ کے اوراق پلٹتے ہیں تو یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اُنھوں نے اپنے مقالے کا عنوان بھی اپنے مزاج کے مطابق ہی رکھا۔ وہ ابتداءً شاعر تھے اور زندگی بھر شاعری کے آب وِ گل ہی سنوارتے رہے۔

ترقی پسند غزل اس دور میں خوب نکھر رہی تھی اور اس کا تذکرہ کیے بغیر آگے نہیں بڑھا جاسکتا تھا، اس لیے کتاب کے پہلے ہی حصے میں جو ’غزل‘ کے عنوان سے ہے اور 1947 سے 1951 تک کے ترقی پسندی کے رجحانات بلکہ اس سے قبل کی صورتِ حال کا بھی انھوں نے جائزہ لیا ہے۔ اس باب میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

’ترقی پسند غزل اپنے طے شدہ نتائج کو منظّم کرنے کی وجہ سے اس انفرادی اور طلسمی فضا آفرینی سے محروم رہتی ہے، جس کی اچھی شاعری کو اکثر ضرورت رہتی ہے۔ پھر ترقی پسند غزل کے کچھ ایسے مطالبات ہیں جن میں فن کو ثانوی اور مقصد کو پہلی حیثیت حاصل ہوجاتی ہے، اس لیے نہ کہنا کہ غزل ترقی پسند بھی ہو اور غزل بھی ہو، ناممکن ہے۔ ایک انتہا پسندانہ رویہ ہوگا۔ غزل کے یہ چند اشعار ایسے ہیں جو ترقی پسندی کی تمام جکڑ بندیوں اور مطالبوں کا منہ بھی بند کردیتے ہیں۔‘

(آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ، بشیر بدر، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، اشاعتِ دوم 2023، ص 44-43)

حوالے کے طور پر مجروح سلطان پوری کے دوشعر دیکھیں:

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اُسی بانکپن کے ساتھ

---

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اور ظہیر کاشمیری کا شعر:

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغِ آخرِ شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے

اوپر درج کیے گئے اشعار میں فکر کی انفرادی بلندی نے وزن پیدا کردیا ہے اور لوگ پڑھنے پر مجبور ہوگئے بلکہ ’میں اکیلا ہی چلا تھا...‘ جو مجروح سلطانپوری کا ہے، لیکن بڑی سادہ بات کو انھوں نے بڑے سہل انداز میں بیان کیا ہے کہ ترقی پسندی کے رجحانات مزید واضح شکل میں سامنے آتے ہیں۔

جب ہم ’آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ‘ پر نظر ڈالتے ہیں ہیں تو اس کی فہرست سے ہی اندازہ ہوجاتا ہے کہ انھوں نے کتنی محنتِ شاقہ کے بعد یہ مقالہ تیار کیا ہوگا۔ سب سے پہلے تو اس تنقیدی کتاب کا انتساب ہی چونکانے والا ہے۔ دراصل بشیر بدر کے رگ و ریشے میں غزل اس طرح سرایت کرگئی تھی کہ ان کے ہربُنِ مُو سے غزل کے اشعار ہی نکلتے تھے۔ انھوں نے اس کتاب کا انتساب اپنی پہلی اہلیہ قمر جہاں شہناز کے نام کیا ہے جو ان کے ابتدائی کشمکشِ روزگار کے دنوں کی ساتھی رہی ہیں، اور شعر لکھا ہے:

کبھی دن کی دھوپ میں جھوم کے کبھی شب کے پھول کو چوم کے
یونہی ساتھ ساتھ چلیں سدا، کبھی ختم اپنا سفر نہ ہو

لیکن محترمہ قمر کا 1984 میں انتقال ہوگیا اور بشیر بدر اکیلے رہ گئے۔ حالاں کہ بعد میں انھوں نے دوسری شادی ڈاکٹر راحت سے کی جو بعد میں راحت بدر کہلائیں اور مسلسل تقریباً 15 برس تک ان کی ایسی خدمت کی جو کم ہی شوہروں کے حصے میں آتی ہے۔

یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ 1947 سے 1951 تک ہے، جس میں غزل کے زیرِ عنوان رسائل میں نظم وغزل کا تناسب، ترقی پسند غزل، ترقی پسند ادیب، ترقی پسند شاعری کے اثرات غزل پر، عشقیہ غزل اور تقلیدی شاعری پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ترقی پسند غزل سے متعلق بشیر بدر کا خیال ہے:

’’آزادی سے پہلے کا تمام ترقی پسند شعری ادب جس میں بلاشبہ نظمیں زیادہ ہیں، یہ انھی ترقی پسندی کے پہلے مینی فیسٹو اور دیگر اہم بیانات اور مضامین سے مطابقت ...(بقیہ صفحہ 9 پر)

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

Printed and Published by ***Abdul Bari*** on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002 and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006, Editor: *Dr Ather Farouqui*